قوم اور قومیّت

استالین

نیا ادارہ • لاہور

قوم اور قومیّت

M. Talib Mukhtar
16/7/5?
261

قوم اور قومیّت

(استالین)

مترجم طفیل احمد خاں۔ ایم اے

ایڈیٹر "معاشیات"

نیا ادارہ لاہور

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No 012975
★ MAILSI ★

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

طبع اوّل

قیمت عہ

کوآپریٹو کیپیٹل پرنٹنگ پریس میں چھپکر مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوئی

ترتیب

قوم سے کیا مراد ہے؟

قوم کی ہیئت ترکیبی کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ کوئی قوم کسی ایک ہی قبیلے یا انسانی جماعت یا کسی ایک ہی نسل کے افراد پر مشتمل نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ سوچنا غلط ہے کہ انگریز قوم کے تمام افراد ہزاروں سال پہلے کے کسی واحد قبیلے کی اولاد ہیں یا ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جدید اطالوی قوم متعدد انسانی جماعتوں اور نسلوں سے مل کر بنی ہے مثلاً رومی، جرمانی، اٹرسکی، یونانی، عربی وغیرہ۔ اسی طرح فرانسیسی قوم میں بھی ابتدائی زمانے کی مختلف اور متعدد نسلوں اور انسانی جماعتوں کے خون کی آمیزش ہے جیسے گالی، رومی، برطانوی

جرمین وغیرہ۔ انگریز اور جرمن قوموں کا بھی یہی حال ہے یعنی ان کے خون میں بھی مختلف قوموں اور نسلوں کے خون کی آمیزش ہے۔ غرض قوم کسی ایک ہی قبیلے یا نسل کے بطن سے نہیں جنم لیتی۔ قوم کی ترتیب و تعمیر میں دراصل تاریخ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ تاریخی عمل اور تاریخی طاقتیں مختلف نسلوں اور جماعتوں کے افراد کو قومیت کے باہمی رشتے میں منسلک کر دیتی ہیں۔ قوموں کو تاریخ وجود میں لاتی ہے نہ کہ نسل یا قبیلہ۔

لیکن یہاں پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ سکندر کی عظیم الشان سلطنتیں بھی تاریخی طاقتوں کی پیداوار تھیں لیکن کیا ان سلطنتوں کے تمام افراد کسی ایک ہی قوم کے افراد کہے جا سکتے ہیں یقیناً نہیں معلوم ہوا کہ ہم ہر ایسے انسانی اجتماع کو جسے تاریخ وجود میں لاتی ہو، قوم کا لقب نہیں دے سکتے۔ اس کے لئے کسی اور شرط کا پورا ہونا ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ جان لینا چاہئے کہ سکندر اعظم* یا سیرس کی سلطنت کو ہم کیوں قوم نہیں کہہ سکتے۔ دراصل یہ سلطنتیں مختلف انسانی گروہوں کے ایک ڈھیلے ڈھالے اجتماع سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ ان گروہوں کے درمیان بنیادی اور اندرونی

---

* یا مغلوں کی سلطنت کو۔ (مؤلف)

طور پر کوئی اشتراک یا اتحاد نہیں ہوتا تھا۔ یہ سلطنتیں محض کچھ خارجی طاقتوں کی بنا پر وجود میں آجاتی تھیں اور ان سے مختلف انسانی گروہوں کی سیاسی زندگی کا ایک سطحی اتحاد ہو جاتا تھا۔ یہ خارجی طاقتیں کیا تھیں۔ جو انہیں عارضی طور پر ایک ہی سیاسی نظام کے ماتحت لے آتی تھیں ؟ مثلاً کسی فاتح کی فتح، اور اگر بعد میں وہ فاتح یا اس کی اولاد شکست کھا گئی تو پھر اس سطحی سیاسی اتحاد کے تار و پود بکھر جاتے تھے اور سلطنت میں شامل انسانی گروہ الگ الگ ہو جاتے تھے[1] نتیجہ یہ نکلا کہ ہم ایسی انسانی جمعیت کو قوم کا لقب نہیں دے سکتے۔ جو عارضی اور وقتی طور پر وجود میں آئی ہو۔ قوم کہلانے کے لئے اس انسانی جمعیت کے اتحاد کا مضبوط اور پائدار ہونا ضروری ہے۔ قوم انسانوں کے مضبوط اور پائدار گروہ کا نام ہے اور یہی وہ شرط ہے۔ جس کے پورا ہوئے بغیر تاریخ کے ذریعے وجود میں آنے والی کسی انسانی جماعت کو ہم قوم کا لقب نہیں دے سکتے۔

لیکن معاملہ یہاں پر آکر بھی نہیں رُکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم ہر مضبوط اور پائدار گروہ کو قوم نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً آسٹریا یا روس کی مثال لے لیجئے۔ یہ دونوں بہت مضبوط اور پائدار سیاسی گروہوں کے نام ہیں۔

---

[1] مغل سلطنت یا پٹھان سلطنت کی تاریخ اس حقیقت کی واضح مثالیں ہیں (مولف)

لیکن ہم ان میں سے کسی کو بھی ایک قوم نہیں قرار دے سکتے۔ آسٹریا یا روس مضبوط سیاسی گروہ ہیں لیکن وہ قومی گروہ نہیں ہیں۔ قومی گروہ اور سیاسی گروہ کے فرق کو سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ دونوں کے درمیان متعدد باتیں باعثِ امتیاز ہیں، جن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ قومی گروہ کے تمام افراد میں کسی ایک مشترکہ زبان کا رائج رہنا ضروری ہے۔ سیاسی گروہ کے لئے لسانی اشتراک و اتحاد شرط نہیں ہے۔ زیکوسلاویکیہ کی قومیت اس لئے وجود میں آئی کہ وہاں ایک مشترکہ زبان رائج تھی۔ اسی طرح پولینڈ کی قومیت بھی اپنی ایک مشترکہ زبان کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی تھی۔ اس کے برخلاف روس یا آسٹریا میں سیاسی اتحاد قائم ہے۔ لیکن دونوں کی حدود کے اندر متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہاں پر زبان سے مراد وہ ٹوٹی پھوٹی زبان ہے جو عوام کی روزمرّہ زندگی میں مستعمل ہوتی ہے۔ اس سے مراد سرکاری زبان نہیں ہے۔ لیکن اس لسانی اختلاف سے روس یا آسٹریا کا سیاسی اتحاد متاثر نہیں ہوتا غرض قومیت کی ایک شرط لسانی اشتراک بھی ہے۔

لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ دنیا کی تمام قومیں مختلف اور علیحدہ علیحدہ زبانیں استعمال میں لائیں؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک سے زیادہ قوموں میں ایک ہی زبان رائج ہو۔ پھر کیا ایک ہی زبان بولنے والے

تمام افراد لازمی طور پر ایک ہی قوم سے متعلق ہوتے ہیں؟ ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ ایک ہی قوم کے تمام افراد میں ایک ہی زبان کا رائج ہونا تو ضروری ہے۔ لیکن یہ بالکل لازمی نہیں کہ مختلف قومیں مختلف زبانیں ہی بولیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی قوم نہیں جس کے افراد بیک وقت مختلف زبانیں استعمال میں رکھتے ہوں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ دنیا میں دو ایسی مختلف قوموں کا وجود غیر ممکن ہے جو ایک ہی زبان بولتی ہوں۔ انگریز اور امریکی ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ لیکن کیا دونوں ایک ہی قوم ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ناروے اور ڈنمارک کی زبان ایک ہی ہے۔ لیکن دونوں علیحدہ علیحدہ قومیتوں کے حامل ہیں۔ انگریزی اور آئرش لوگوں کی مثال لے لیجیے۔ یہ دونوں قومیں ایک ہی زبان بولتی ہیں لیکن دونوں کا قومی اختلاف دیکھ لیجیے۔

سوال یہ ہے کہ انگریز اور امریکی ایک ہی زبان بولنے کے باوجود ایک ہی قوم کیوں نہیں ہیں۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انگریز اور امریکی ایک ہی خطے میں آباد نہیں ہیں بلکہ مختلف خطوں میں۔ قومیت کی بنیاد کی تعمیر کرنے اور اسے مضبوط کرنے کے لئے ضروری ہے کہ لوگ پشت ہا پشت سے ساتھ رہ رہے ہوں۔ تبھی تو ان کے درمیان مسلسل، مستقل اور طویل تعلقات اور رشتے پیدا ہو سکتے ہیں۔ جو ان کو واحد قومیت کے رشتے میں

منسلک کر دینگے لیکن یہ ایک بالکل صاف بات ہے کہ لوگ اس وقت تک پُشت ہا پُشت تک ایک ساتھ نہیں رہ سکتے جب تک وہ ایک ہی خطۂ ارض میں آباد نہ ہوں۔ انگریز اور موجودہ امریکیوں کے آباؤ اجداد پہلے ایک ہی خطۂ ارض یعنی انگلستان میں آباد تھے۔ اس لئے ایک ہی قوم کے افراد تھے۔ پھر انگلستان کی آبادی کا ایک حصہ اپنا آبائی وطن چھوڑ کر ایک نئے خطے یعنی امریکہ میں جا بسا۔ یہاں زمانے کی طاقتیں ایک نئی قوم کو جنم دینے لگیں۔ ثابت ہوا کہ مختلف زمینی خطے مختلف قوموں کو جنم دیتے ہیں چنانچہ قوم کو وجود میں لانے کے لئے ایک ہی خطۂ ارض میں رہنا بھی شرط ہے۔

لیکن محض ایک ہی ملک یا خطے میں رہنا قوم بننے کے لئے کافی نہیں یہ ضروری ہے کہ قوم کے افراد میں معاشی تعلقات کی ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔ اگر کوئی انسانی جماعت ایک ہی خطۂ ارض میں آباد ہو اور قوم بننا چاہتی ہو تو ضروری ہے کہ ایسے معاشی تعلقات اور معاشی طاقتیں موجود ہوں جو اس انسانی جماعت کے مختلف حصوں اور فرقوں کو ایک ملت اور ایک ہی وحدت میں تبدیل کر دیں۔ چونکہ انگلستان اور امریکہ کے درمیان اس قسم کا گہرا معاشی رشتہ نہیں پایا جاتا جو ان دونوں کو ملا کر ایک ہی قوم میں تبدیل کر دے اس لئے وہاں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ امریکہ ہی کی مثال لے لیجئے۔ تو

معلوم ہوگا کہ قومیت کی تعمیر میں معاشی اتحاد کا کتنا اہم حصہ ہوتا ہے۔ امریکہ کے باشندے یورپ کے مختلف ملکوں سے آنے کے باوجود ایک قوم کیوں بن گئے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ معاشی طاقتوں نے تقسیمِ محنت اور ذرائع حمل و نقل کے ذریعے ملک کے تمام حصوں کو باہم منسلک کر دیا اور اس طرح امریکی قوم وجود میں آئی۔

معاشی اتحاد کے بغیر ایک ہی خطّے میں بسنے والے قوم نہیں کہلا سکتے۔ اس کی ایک اور مثال لیجئے۔ جارجیا میں نئی اصلاحات رائج ہونے سے پہلے یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ جارجیا کے بسنے والے ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ حالانکہ وہ ایک ہی خطّے میں آباد تھے اور ان کے درمیان ایک ہی زبان رائج تھی۔ وجہ یہی تھی کہ ان کے اندر معاشی زندگی کا اشتراک و اتحاد موجود نہیں تھا۔ وہ مختلف علیحدہ علیحدہ ریاستوں میں بٹے ہوئے تھے جس کی وجہ سے معاشی اتحاد نہیں ہو پاتا تھا۔ صدیوں تک وہاں کی مختلف ریاستوں کے درمیان جنگ و جدل کا ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ ریاستیں ایک دوسرے کو شکست دینے کے لئے غیر ملکوں سے سازشیں اور ریشہ دوانیاں کرتی تھیں کبھی کسی ریاست نے اپنی حریف ریاست کے خلاف ترکوں کا ساتھ دے دیا۔ کبھی کسی ریاست نے ایرانیوں کا ساتھ دے دیا۔ اس طرح وہاں کی ریاستیں مدتوں تک ترکوں اور ایرانیوں کو ایک دوسرے کے

خلاف بھڑکاتی رہیں۔ اگر کسی ریاست کا بادشاہ بہت طاقتور ہوا اور اپنی پوزیشن میں کامیاب رہا۔ تو وہ تمام ریاستوں کے درمیان عارضی طور پر اتحاد قائم کر دیتا تھا۔ لیکن اس اتحاد کی نوعیت اتفاقی اور مدت مختصر ہوتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ ایک سطحی سرکاری انتظام قائم ہو جاتا تھا جس کے کمزور ہوتے ہی مختلف ریاستیں پھر خود مختار ہو جاتی تھیں اور باہمی جنگ و جدال ختم ہو جاتا تھا۔ ریاست کے حکمرانوں کی غیر ذمہ دارانہ حرکات اور کسانوں کی بے توجہی اور غیر دلچسپی، عارضی اور سطحی نظم حکومت کو جلد ہی تتر بتر کر دیتی تھی۔ چونکہ جارجیا معاشی لحاظ سے غیر متحد تھا۔ اس لئے وہاں اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا اور یہ انتشاری کیفیت کچھ لازمی سی تھی۔ لیکن انیسویں صدی کے نصف آخر میں وہاں معاشی تبدیلی رونما ہوئی۔ جاگیری نظام کا زوال ہوا اور اس کے تار و پود بکھر گئے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے آگے قدم بڑھایا۔ ذرائع حمل و نقل کی ترقی و توسیع ہوئی۔ ملک کی معاشی صورت حال بدلی۔ جارجیا کے مختلف ضلعوں میں تقسیم محنت کی بنیاد پڑی۔ یعنی کوئی بھی ضلع خود کفیل نہیں رہا۔ معاشی لحاظ سے ایک ضلع دوسرے ضلع کا ضرورتمند بن گیا۔ پہلے ایک ریاست دوسری ریاست سے معاشی لحاظ سے بے نیاز تھی۔ لیکن اب لازمی طور پر اس بے نیازی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح پورے جارجیا میں معاشی اتحاد اور معاشی مفاد کا

ایک جال سا پھیل گیا جس نے جارجیا کی تمام ریاستوں کو متحد کر دیا۔ اس طرح انیسویں صدی کے نصف آخر میں جارجیا ایک متحدہ قوم کی حیثیت سے منظرِ عام پر رونما ہوا۔

یہی بات ان تمام قوموں پر صادق آتی ہے جو جاگیری دور سے گزر کر سرمایہ دارانہ نظام میں قدم رکھ چکی ہیں اور آگے بڑھ رہی ہیں جاگیری نظام میں معاشی انتشار تھا۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام میں معاشی اتحاد و اشتراک کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس لئے سرمایہ داری کا عروج قوموں کو وجود میں لاتا ہے۔ غرض معاشی زندگی کا اشتراک اور معاشی یکجہتی قومیت کا ایک لازمی عنصر ہے۔

لیکن ابھی قومیت کے تمام عناصر کا تذکرہ ختم نہیں ہوا۔ ہمیں قوم کے افراد کے مخصوص روحانی کردار کو بھی زیرِ غور لانا ہے۔ ایک ہی قوم سے متعلق مختلف افراد کا ایک مخصوص روحانی اور داخلی انداز ہوتا ہے۔ غرض کہ قومیں نہ صرف زندگی کے خارجی حالات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ بلکہ اپنی داخلی اور روحانی خصوصیات کے لحاظ سے بھی یہ داخلی اور روحانی فرق مختلف قومی تہذیبوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً انگلستان، امریکہ اور آئرلینڈ میں ایک ہی زبان بولی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں تین مختلف قومیں آباد ہیں۔ اس کے متعدد اسباب ہیں لیکن

ان میں سے ایک سبب یہ بھی ہے (جو دوسرے اسباب سے کسی طرح کم اہم نہیں) کہ تینوں قوموں کی نفسیاتی ساخت علیحدہ علیحدہ ہے۔ یہ نفسیاتی اختلاف نتیجہ ہے خارجی حالات کے اختلاف کا جو پشت ہا پشت سے چلا آ رہا ہے۔ اس خارجی حالات کے مختلف ہونے کے سبب سے ان کی نفسیاتی ساخت صدیوں سے جدا جدا رہی ہے مختلف خارجی حالات کی گود میں مختلف نفسیاتی ساختیں نشو و نما پا رہی ہیں۔

نفسیاتی ساخت کی بحث کے سلسلے میں یہاں ایک اہم بات پیدا ہو جاتی ہے۔ نفسیاتی ساخت کو آپ دوسرے لفظوں میں قومی کردار کہہ لیجئے یا ان قومی خصوصیات کا مجموعہ جو ایک قوم کے افراد کو دوسری قوم کے افراد سے کئی باتوں میں ممیز کرتی ہیں ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ قومی کردار بجائے خود ایک غیر مرئی چیز ہے۔ وہ بجائے خود ایسی چیز نہیں کہ اس کو بیان کیا جا سکے۔ یا اس کی شکل و صورت متعین کی جا سکے۔ لیکن اگر ہم کسی قوم کے مخصوص کردار کو پہچان سکتے ہیں تو صرف اُس کی تہذیب میں۔ قومی کردار کا اظہار اس کی تہذیب میں ہوتا ہے اور کسی قوم کی تہذیب ہی کا مطالعہ کر کے ہم اُس کے مخصوص قومی کردار اور نفسیاتی ساخت کو پہچان سکتے اور اس کا یقین کر سکتے ہیں۔ قومی تہذیب ہی سے پتہ چلتا ہے کہ فلاں قوم کا فلاں قومی کردار ہے اور اس کی نفسیاتی ساخت یہ ہے۔ اس طرح

ہم کسی قوم کی نفسیاتی ساخت یا دوسرے لفظوں میں اس کے قومی کردار کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

یہ بالکل واضح سی بات ہے کہ قومی کردار کوئی ایسی چیز نہیں کہ ایک ہی بار دفعتہً وجود میں آجائے اور پھر ہمیشہ اسی طرح قائم رہے۔ زندگی کے خارجی حالات کے ساتھ ساتھ قومی کردار کی شکل و شباہت میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن زندگی کے ہر لمحے میں اس کا وجود ضرور رہتا ہے۔ چاہے وہ پہلے کی نسبت کتنا ہی تبدیل ہو چکا ہو۔ چنانچہ قومی کردار کے اثرات ظاہر ہو کر رہتے ہیں اور وہ خارجی حالات پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں غرض ایک ہی قوم کے تمام افراد میں نفسیاتی ساخت اور قومی کردار کا مشترک ہونا بھی لازمی ہے۔ جس کا اظہار اس مخصوص قوم کی تہذیب میں ہوتا ہے۔

یہ ہیں قومیت کے اجزائے لاینفک، قومیت کے تمام لازمی عناصر کا بیان مکمل ہو چکا۔ اوپر جو کچھ کہا جا چکا ہے۔ اسے مختصراً چند لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ "قوم انسانوں کے ایک ایسے پائدار مضبوط گروہ کا نام ہے جس کے ارتقا و عروج میں تاریخ نے ہاتھ بٹایا ہو اور جس کے اندر اشتراکِ زبان، اشتراکِ ارض، اور اشتراکِ معاش پایا جاتا ہو اور ساتھ ہی اس کی نفسیاتی ساخت بھی ایک ہی سی ہو —— وہ نفسیاتی

ساخت جس کا اظہار تہذیبی اتحاد و اشتراک کی صورت میں ہوتا ہے۔"

"اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا کہ قوم تمام دیگر تاریخی مظاہر کی طرح تبدیلی اور انقلاب کا گہوارہ ہے اور اس کی ایک مخصوص تاریخ اور ایک مخصوص ابتدا اور انتہا ہوتی ہے۔"

اوپر قومیت کی جن خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے کسی تنہا خصوصیت کی بنا پر ہم کسی انسانی جماعت کو قوم نہیں کہہ سکتے یعنی فرض کر لیجئے کہ کسی انسانی جماعت میں متذکرہ بالا خصوصیات میں سے کوئی ایک ہی خصوصیت پائی جاتی ہے تو ہم اس انسانی جماعت کو قوم نہیں کہہ سکتے۔ ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی انسانی جماعت میں قومیت کی باقی خصوصیتیں تو موجود ہوں۔ لیکن ایک کی کمی ہو تو ممکن ہے محض ایک ہی خصوصیت کی وجہ سے وہ انسانی جماعت قوم کہلانے کی مستحق نہ ہو اور اس کا قوم بننا غیر ممکن ہو جائے۔ مثلاً انسانوں کی کسی جماعت میں نفسیاتی ساخت کا اشتراک پایا جاتا ہو اور اس کا ایک مخصوص قومی کردار بھی ہو۔ لیکن اگر اس جماعت میں معاشی زندگی کا اشتراک موجود نہیں ہے اور وہ کسی ایک ہی خطے میں آباد نہیں ہے اور اس کی زبان بھی مشترکہ نہیں ہے تو ہم ایسی انسانی جماعت کو صرف قومی کردار کے ایک ہونے کی بنا پر قوم کا لقب نہیں دے سکتے۔ روس، اگالیشیا

امریکہ، جارجیا اور کوہ قاف کے یہودیوں کو لے لیجئے۔ جو ایک ہی قومی کردار رکھتے ہوتے بھی ایک قوم نہیں ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ ایک ہی خطۂ ارض میں آباد ہوں اور مشترکہ معاشی زندگی میں بھی منسلک ہوں لیکن اگر ان کے اندر نہ زبان مشترک ہے اور نہ قومی کردار کا اشتراک موجود ہے تو پھر وہ ایک قوم نہیں کہلا سکتے۔ علاقہ بالٹک کی جرمن قوم اور لیٹوی قوم کی مثال لے لیجئے جو صرف لسانی اور نفسیاتی اشتراک نہ ہونے کی وجہ سے کسی ایک قوم کے افراد نہیں کہلا سکتے۔ پھر ناروے اور ڈنمارک کے باشندے ایک ہی زبان بولتے ہیں لیکن دوسری خصوصیات کی عدم موجودگی کے باعث وہ ایک قوم نہیں ہیں۔ غرض قومیت کی تعمیر کے لئے مندرجہ بالا تمام خصوصیات کا مجموعی طور پر پایا جانا ضروری ہے اور صرف کسی تنہا امتیازی خصوصیت کا پایا جانا کافی نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جب ہم مختلف قوموں کا آپس میں موازنہ اور مقابلہ کرنے بیٹھیں گے تو کوئی ایک خصوصیت دوسری خصوصیات کی نسبت زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آئے گی۔ مثلاً اگر کسی قوم کیساتھ قومی کردار زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئے گا تو دوسری قوم میں اشتراک زبان زیادہ اہم معلوم ہوگا۔ تیسری قوم کی زندگی میں ہمیں اشتراکِ ارض یا معاشی حالات زیادہ اہم نظر آئیں گے لیکن بہر حال قومیت اگر کوئی چیز ہے تو ان تمام خصوصیات کا مجموعہ ہی ہے۔

قومیّت کا ارتقا اور عروج

قومیت کے ارتقا اور عروج کو ہم مختلف دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جب یورپ کے مغربی ملکوں میں یعنی آئرلینڈ کو چھوڑ کر برطانیہ، فرانس اور اٹلی میں کچھ حد تک جرمنی میں جاگیری نظام کا زوال ہوا اور سرمایہ دارانہ نظام نے فتح پائی۔ اسی زمانے میں مغربی یورپ کی آبادی مختلف قوموں میں تقسیم ہو گئی۔ ان ملکوں میں یہ ہوا۔ کہ جس زمانے میں وہاں جاگیری نظام کا زوال ہو رہا تھا اور مختلف قومیں وجود میں آ رہی تھیں۔ اسی زمانے میں ان ملکوں میں مضبوط مرکزی ریاستیں قائم ہوئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الگ الگ قومیں الگ الگ ریاستوں

میں تشکل پذیر ہو گئیں اور اسی تشکل میں ترقی کی منزلیں طے کرنے لگیں۔ ان میں سے کسی بھی ریاست کے اندر کسی بڑی غیر ملکی یا غیر قومی جماعت یا اقلیت کا وجود نہیں تھا چنانچہ ریاست کے اندر ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم و تشدد کا وجود نہ رہا مثلاً فرانس میں کوئی غیر فرانسیسی اقلیت نہیں تھی اور نہ برطانیہ میں کوئی غیر برطانوی اقلیت، چنانچہ جب وہاں قومیت نے آگے قدم بڑھایا تو غیر قومی اقلیت پر قومی اکثریت کے جبر و تشدد کا سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا مشرقی یورپ میں حالات اس سے مختلف تھے۔ یعنی جس زمانے میں ہنگری آسٹریا اور روس میں مختلف قومیں بن رہی تھیں اور جاگیری نظام کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی تھیں۔ اسی زمانے میں وہاں مضبوط مرکزوں والی ریاستیں قائم نہیں ہوئیں بلکہ اس سے پہلے یعنی ان ملکوں میں مضبوط مرکزوں والی ریاستیں بہت پہلے قائم ہو چکی تھیں اور کافی مدت کے بعد جا کر کہیں ان ملکوں کی آبادی مختلف قوموں میں تشکل پذیر ہوئی اور جاگیری نظام کا زوال ہوا۔ جس زمانے میں وہاں مضبوط مرکز والی ریاستیں قائم ہوئیں۔ اس وقت سرمایہ داری نے ابھی ترقی نہیں کی تھی بلکہ ابھی اس کی شروعات ہی ہوئی تھی۔ جب تک سرمایہ داری کا عروج نہیں ہوتا۔ اس وقت تک قومیں بھی وجود میں نہیں آتیں۔ اسی لئے مضبوط مرکز والی ریاستوں کے قائم ہو جانے کے بہت دیر بعد وہاں قومیں وجود میں آئیں مضبوط مرکز والی ریاستیں قائم

کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ روس، آسٹریا اور ہنگری کو ترکوں
منگولوں اور دیگر ایشیائی حملہ آوروں سے ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا تھا۔ چنانچہ
ان ملکوں کے لوگوں نے حملہ آوروں کی مدافعت اور اپنی حفاظت کے
پیشِ نظر یہ محسوس کیا کہ فوری طور پر مضبوط مرکز والی ریاستیں قائم کی جائیں
اس طرح مشرقی یورپ میں مضبوط مرکز والی ریاستیں جلد ہی یعنی قومیت
اور سرمایہ داری کے عروج سے پہلے ہی قائم ہو گئیں اور قومیں بعد میں
تشکیل پذیر ہوئیں۔ برخلاف اس کے مغربی یورپ میں مضبوط مرکز والی ریاستیں
اسی زمانے میں قائم ہوئیں جب سرمایہ داری اور قومیت فاتحانہ آگے
بڑھ رہی تھیں۔ مشرقی یورپ میں قوموں کے تشکیل پذیر ہونے سے پہلے ہی
مضبوط مرکز والی ریاستیں قائم ہو گئیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ریاست میں
مختلف قوموں کے لوگ شامل ہو گئے۔ یہ قومیں ابھی تک قومیت کی ابتدائی
منزل میں تھیں۔ مکمل طور پر علیحدہ علیحدہ قومیں نہیں بن سکی تھیں۔ مغربی یورپ
کی ہر ریاست ایک قوم کے افراد پر مشتمل تھیں۔ لیکن مشرقی یورپ میں کوئی
بھی ریاست کسی ایک واحد قوم پر مشتمل نہیں تھی بلکہ مختلف قوموں پر۔ جو
فوجی حفاظت اور مدافعت کی خاطر مضبوط مرکز والی مشترکہ ریاستوں میں
منسلک اور متحد ہو گئی تھیں۔

غرض قومیت کے ارتقا کے پہلے دور میں ہمیں دو باتیں نظر آتی ہیں۔

سرمایہ داری کے ابتدائی زمانے میں مختلف قومیں تشکیل پذیر ہوئیں مغربی یورپ میں یہ ہوا کہ خالصتاً قومی ریاستیں وجود میں آئیں۔ ان میں سے ہر ریاست چونکہ ایک ہی قوم کے افراد پر مشتمل تھی۔ اسی لئے ریاست کے اندر ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم و تشدّد کا سوال ہی نہیں تھا لیکن مشرقی یورپ میں ایسی ریاستیں پیدا ہوئیں۔ جن میں سے کوئی بھی ریاست کسی ایک واحد قوم پر مشتمل نہیں تھی۔ بلکہ مختلف اور متعدد قوموں پر۔ مشرقی یورپ کی ہر ریاست میں یہ صورت تھی کہ کوئی ایک قوم سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اور تمام دوسری قومیں اس کے مقابلے میں پچھڑی ہوئی ہیں۔ یہ ترقی یافتہ قوم ریاست میں شامل تمام دوسری پچھڑی ہوئی قوموں پر سیاسی لحاظ سے حاوی رہتی ہے اور آگے چل کر اس کا معاشی تسلّط بھی قائم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مشرقی یورپ کی انہیں کثیر القومی ریاستوں میں ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم و تشدّد کا سوال پیدا ہوا اور اس طرح قومی تصادم، قومی تحریکیں اور قومی مسئلے وجود میں آئے اور ان کو سلجھانے کے مختلف طریقے پیدا ہوئے۔ یہ تھا قومیّت کے عروج کا پہلا دور۔۔۔۔

قومیّت کے عروج کا دوسرا دور وہ ہے جب سامراج (Imperialism.) وجود میں آیا۔ یعنی جب سرمایہ داری

منڈیوں اور کچے مال، ایندھن، اور سستی محنت کی تلاش میں ملکی حدود سے باہر نکلی۔ سرمایہ داروں کو صنعتی اشیا پیدا کرنے کے لئے سستے سے سستے داموں پر مزدوروں کی ضرورت تھی تاکہ جتنے کم خرچ پر اشیا تیار ہو جائیں اتنا ہی انہیں زیادہ داموں پر بیچکر منافع حاصل کیا جا سکے۔ پھر سرمایہ داروں کو اپنی بنی ہوئی چیزوں کو بیچنے کے لئے منڈیوں کی ضرورت تھی۔ پھر سرمایہ دار اپنا سرمایہ دوسرے ملکوں میں بھی لگانا چاہتے تھے۔ تاکہ دوسرے ملکوں کا اچھی طرح استحصال ہو سکے اور وہ منافع کما سکیں۔ پھر جن ملکوں کا وہ استحصال کر رہے ہیں۔ ان سے تعلقات کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے سمندر اور خشکی کے راستوں پر قبضہ جمانے کی ضرورت تھی۔ اس طرح مغربی یورپ کے سرمایہ دار اپنی اپنی قومی ریاستوں کی حدوں کو توڑ کر نزدیک اور دور کے ہمسایہ ملکوں کو غلام بنا لیتے ہیں۔ قومیت کے عروج کے اس دوسرے دور میں مغربی یورپ کی پرانی قومی ریاستیں (یعنی برطانیہ، اٹلی اور فرانس) نہیں رہتیں۔ بلکہ بڑی بڑی کثیر القومی ریاستوں میں بدل جاتی ہیں۔ ان کے قبضے میں نئے نئے علاقے ہوتے ہیں اور وسیع و عریض نو آبادیات، یہ کثیر القومی ریاستیں ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم و تشدد کا اکھاڑا بن جاتی ہیں۔ اور نو آبادیات کے لوگوں پر سرمایہ دار حاکم قوم کا استحصال اور تشدد ہونے لگتا ہے۔ یہ استحصال اور تشدد وہی ہے جو مشرقی یورپ کی کثیر القومی

ریاستوں میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس دور میں یقینی قومیت کے ارتقا و عروج کے دوسرے دور میں۔ جبکہ مغرب کی قومی ریاستیں سامراجی ریاستوں میں تبدیل ہو گئی تھیں چیکوسلاویکیا، پولینڈ اور یوکرین میں قومی بیداری پیدا ہوئی اور قومی تحریکوں نے سر اٹھایا۔ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کی سامراجی جنگ کے دوران میں یہاں کی قومی تحریکوں نے پرانی بورژوا کثیر القومی ریاستوں کے تار و پود بکھیر دیئے اور ان کی غلامی سے نجات پاکر نئی قومی ریاستیں قائم کر لیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ یہ نئی قومی ریاستیں دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کی حلقہ بگوش ہو کر رہ گئیں۔ اس لئے کہ وہ آزادانہ طور پر اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتی تھیں۔

قومیت کے عروج کا تیسرا دور وہ ہے۔ جو سوویٹ نظام کے قائم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ دور اس طرح شروع ہوا کہ دنیا کے ۱/۶ حصے میں سرمایہ دارانہ نظام کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم و تشدد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے شروع ہونے کے بعد دنیا کے جس حصے میں سوویٹ نظام قائم ہوا۔ وہاں نہ حاکم قوم کا وجود رہا اور نہ محکوم کا نہ نوآبادیات کا سوال رہا اور نہ نوآبادیات کا استحصال کرنے والے ملک کا۔ یہ تمام سوالات اور مسئلے کم سے کم اس خطۂ ارض کے لئے جہاں سوویٹ نظام قائم ہے۔ تاریخ کے بوسیدہ طاقوں میں رکھ دیئے گئے

ہیں۔ اس دور میں سوویٹ نظام کے تحت تمام قوموں کو یکساں حقوق اور ترقی کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہیں۔ لیکن فی الحال یہ قومیں معاشی اور سیاسی اور تہذیبی ترقی کے لحاظ سے ایک ہی سطح پر نہیں ہیں۔ یہ نابرابری انقلاب سے پہلے کے حالات کی پیدا کی ہوئی ہے ــــ ماضی میں تاریخی عروج کچھ اس قسم کا رہا کہ ایک قوم یعنی روسی قوم سوویٹ نظام میں شامل دوسری قوموں کے مقابلے پر سیاسی اور صنعتی لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ ہو گئی۔ انقلاب کے بعد یہ قومی نابرابری گویا ورثے میں ملی۔ یہ نابرابری ایک سال میں ختم نہیں کی جاسکتی۔ لیکن یہ ایک یقینی امر ہے کہ اسے ختم کر دیا جائے گا۔ اور وہ اس طرح کہ معاشی، سیاسی اور تہذیبی لحاظ سے پچھڑی ہوئی قوم کی امداد اور اعانت[۱] کی جائیگی ؛

---

[۱] اسٹالن کی جس تصنیف سے یہ اقتباسات لئے گئے ہیں۔ وہ آج سے بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ چنانچہ اس کے بعد حالات بہت بدل چکے ہیں اور سوویٹ نظام میں جو قومیں شامل ہیں۔ ان کے درمیان معاشی اور تہذیبی لحاظ سے بہت حد تک برابری قائم کی جاچکی ہے ؛ (مؤلف)

قومیت سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہے

اوپر کہا جا چکا ہے کہ قومیت تاریخ کے ایک مخصوص دور میں پیدا ہوئی۔ یہ دَور تھا سرمایہ داری کے عروج کا۔ قومیت اسی مخصوص دور میں پیدا ہو سکتی تھی جس دَور میں جاگیری نظام کا پیدا کردہ انتشار اور پراگندگی ختم ہو رہی تھی اور سرمایہ دارانہ نظام آگے قدم بڑھا رہا تھا۔ اسی زمانے میں مغربی یورپ کی آبادی مختلف قوموں میں تقسیم ہو رہی تھی یعنی اس زمانے میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی اور دیگر ملکوں کے لوگ مختلف قوموں میں بٹ رہے تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے ایک ہی علاقے کے لوگوں کو انتشار اور پراگندگی کی دلدل سے نکال کر قومی یکجہتی اور جمعیت بندی کے رشتے میں

منسلک کر دیا اور اس طرح مختلف قومیں وجود میں آئیں۔ مغربی یورپ میں جب قومیت تشکل پذیر ہوئی اور مختلف قومیں وجود میں آئیں۔ تو اس کے ساتھ ہی وہ مختلف قومیں آزاد ریاستوں میں تشکل پذیر ہو گئیں۔ یعنی قوموں کے وجود میں آنے کا عمل اور آزاد ریاستوں کے وجود میں آنے کا عمل ساتھ ساتھ ہوا۔ برطانیہ، فرانس اور مغربی یورپ کے دوسرے ملکوں کی قومیں بیک وقت برطانیہ اور فرانس وغیرہ کی ریاستیں بھی ہیں۔ یعنی فرانس بیک وقت ریاست بھی ہے اور قوم بھی، برطانیہ بیک وقت ریاست بھی ہے اور قوم بھی۔ آئر لینڈ چونکہ اس سیاسی تبدیلی کے عمل سے نہیں گزر سکا۔ اس لئے وہاں عام صورتِ حال نہیں بدل سکی۔ دوسرے لفظوں میں آئر لینڈ بیک وقت ایک آزاد ریاست اور ایک قوم نہیں بن سکا۔ مغربی یورپ میں قوموں نے ترقی کر کے ریاستوں کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن اس کے برخلاف مشرقی یورپ میں کثیر القومی ریاستیں قائم ہوئیں۔ یعنی وہاں کی کوئی بھی ریاست کسی ایک ہی قوم پر مشتمل نہیں تھی بلکہ متعدد قوموں پر۔ ایک ایک ریاست کے حدود میں مختلف قومیں شامل تھیں۔ اسی لئے ہم نے ایسی ریاست کو کثیر القومی ریاست کا نام دیا ہے۔ آسٹریا، ہنگری اور روس۔ مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ ان کثیر القومی ریاستوں کے حدود میں جو قوم سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ وہ ریاست کے

حدود میں بسنے والی تمام دیگر قوموں پر حاوی ہو گئی۔ آسٹریا کے جرمن سیاسی لحاظ سے سب سے ترقی یافتہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے آسٹریا کی تمام قوموں کو ایک ریاست میں منسلک کر دیا۔ اسی طرح ہنگری کی میگیار قوم نے ہنگری کی تمام دوسری قوموں کو ایک ریاستی نظام کے تحت منظم کر دیا۔ اس لیے کہ میگیار قوم ہنگری میں بسنے والی تمام دوسری قوموں کے مقابلے میں ریاستی سیاسی نظم و نسق میں سب سے ہوشیار تھی۔ اسی طرح روس میں تمام قوموں کو ایک سیاسی نظام کے تحت لانے کا کام روسی قوم نے انجام دیا۔ روسی قوم کی رہنمائی کی باگ ڈور طبقہ امرا کے فوجی حکام کے ہاتھوں میں تھی۔ امرا کا یہ فوجی طبقہ کافی منظم اور طاقتور تھا اور اسے مخصوص تاریخی طاقتوں نے پیدا کیا تھا۔ اسی طرح آسٹریا میں جرمن قوم، ہنگری میں میگیار قوم اور روس میں روسی قوم کے لوگ ان ریاستوں میں شامل ہو کر دوسری قوموں پر حاوی ہو گئے اور انہیں کی رہنمائی میں وہاں کی کثیر القومی ریاستوں کی سیاسی تنظیم عمل میں آئی۔ ان کثیر القومی ریاستوں کے وجود میں آنے کا عجیب و غریب انداز صرف انہیں ملکوں میں ممکن تھا۔ جہاں ابھی تک جاگیری نظام کو ختم نہیں کیا تھا اور جہاں سرمایہ داری ابھی ابتدائی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ ان کثیر القومی ریاستوں میں جو متعدد قومیں شامل تھیں۔ وہ ابھی سرمایہ دارانہ نظام کے ترقی نہ کرنے کی وجہ سے اس قابل نہیں ہوئی تھیں کہ اپنے

اندر اتحاد اور استحکام پیدا کرکے باقاعدہ اور باضابطہ قوموں کی شکل اختیار کرلیتیں۔ جاگیری نظام کے انتشار اور پراگندگی میں مبتلا ہوتے ہوئے ... ان کے لئے قوموں کی شکل میں منظم ہونا غیر ممکن تھا۔

لیکن آہستہ آہستہ مشرقی یورپ میں بھی سرمایہ دارانہ نظام پھیلنے لگا۔ تجارت اور ذرائع حمل ونقل کی ترقی ہوئی۔ بڑے بڑے شہر وجود میں آئے ہر قوم میں اندرونی معاشی استحکام پیدا ہونے لگا۔ کثیر القومی ریاستوں کی دبی اور پچھڑی ہوئی قوموں کی خاموش اور پرسکون زندگی میں سرمایہ دارانہ نظام نے نئی لہریں پیدا کردیں، وہ بیدار ہوگئیں۔ ان کے اپنے قومی پریس اور اپنے قومی تھیٹر وجود میں آئے۔ قانون ساز مجلسیں بنائی گئیں۔ ان باتوں نے آسٹریا اور روس میں قومی احساسات اور قومی جذبات کو بیدار کردیا۔ مشرقی یورپ کی کثیر القومی ریاستوں میں شامل ہر قوم کا پڑھا لکھا ذہین طبقہ بیدار ہوگیا اور اس کے اندر قومی جذبہ تیزی کے ساتھ ابھرنے لگا۔ ان قوموں کے سامنے آزاد قومی ریاستیں بنانے کا نصب العین تھا اور یہ ایک بالکل فطری بات تھی۔ لیکن اب ان قوموں کے لئے برطانیہ، فرانس اور جرمنی کی قسم کی آزاد ریاستوں میں شکل پذیر ہونا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلے ہی سے کثیر القومی ریاستوں کے نظام میں منسلک تھیں اور ان پر ان کثیر القومی ریاستوں کی سب سے طاقتور قومیں حاوی

تھیں چنانچہ ان حکمران قوموں کا اوپری طبقہ ان نوزائیدہ قوموں کی آزادی اور خودمختاری کا دشمن بن گیا یعنی روس میں روسی قوم کا حکمران طبقہ روسی ریاست میں شامل تمام دیگر قوموں کی آزادی کی تحریک کا دشمن بن گیا اور آسٹریا کے جرمن وہاں کی دوسری قوموں کی آزادی کی تحریک کی مخالفت کرنے لگے۔ ان حاوی قوموں کے حکمراں طبقے نے پہلے ہی سے ریاست پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس لئے یہ ایک بالکل فطری بات تھی کہ اس نے ریاست کی دوسری قوموں کی خودمختاری کی مخالفت شروع کر دی غرض مشرقی یورپ کی قومیں بہت دیر کے بعد میدان عمل میں آئیں۔ آسٹریا میں چیکوسلاوی پولی اور دیگر قوموں نے سر اٹھایا ہنگری میں کروٹ قوم نے خودمختاری کا مطالبہ کیا اور روس میں لیٹوی، لتھوانی، یوکرینی، جارجیائی اور آرمینی قومیں وجود میں آئیں۔ مغربی یورپ میں آئرلینڈ کے ساتھ جو بات تھی۔ وہی ان قوموں کے ساتھ بھی پیدا ہوئی۔ آئرلینڈ میں قومی تحریک نے جنم لیا۔ اسی طرح مشرقی یورپ میں بھی ہر قوم نے اپنی اپنی تحریکیں قائم کیں۔ اس طرح وہ حالات پیدا ہوئے جنہوں نے مشرقی یورپ کی نوخیز قوموں کو جدوجہد پر آمادہ کیا۔

لیکن یہاں پر یہ جان لینا ضروری ہے کہ یہ جدوجہد پوری پوری قوموں کے درمیان نہیں تھی۔ بلکہ حاوی اور شکست خوردہ قوموں کے صرف اوپری حکمران طبقوں کے درمیان مثلاً اگر یوکرین کی قومی تحریک نے روس

کی مرکزی حکومت کے خلاف تحریک چلائی تو اس تحریک میں یوکرین کے صرف اوپری اور متوسط طبقے کے لوگ شامل تھے۔ اس تحریک کی نوعیت یہ تھی کہ محکوم قوم نے اعلیٰ سرمایہ دار طبقے کے خلاف جدوجہد شروع کی چیکوسلاویکی قوم اور جرمن قوم کے حکمراں طبقوں کے درمیان بھی اسی قسم کی جدوجہد شروع ہوئی۔ ان قومی تحریکوں نے ایک اور شکل اختیار کی اور وہ یہ کہ محکوم قوم کے دیہی سرمایہ دار طبقے نے حکمران طبقے کے زمینداروں کیخلاف جدوجہد شروع کی۔ مثلاً یوکرین میں جو تحریک شروع ہوئی تھی۔ اس کی نوعیت یہی تھی۔ یوکرین کے دیہاتی سرمایہ داروں نے پولینڈ کے زمینداروں کے خلاف تحریک چلائی۔ یا پھر ان قومی تحریکوں نے یہ شکل اختیار کی۔ کہ محکوم قوم کے پورے امیر سرمایہ دار طبقے نے حکمراں قوم کے طبقۂ امرا کے خلاف تحریک چلائی۔ جیسے پولینڈ کے خلاف لتھوانیاں کی تحریک آزادی۔ روس کے خلاف یوکرین کی تحریکِ آزادی۔ غرض قومی تحریکوں میں اوپری سرمایہ دار طبقہ ہی آگے رہتا ہے۔ محکوم قوم کا سرمایہ دار طبقہ قومی تحریک میں آگے آگے کیوں رہتا ہے۔ اس کی وجہ جاننا کچھ مشکل نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ محکوم قوم کا نوخیز سرمایہ دار طبقہ یہ چاہتا ہے۔ کہ حاکم قوم کے سرمایہ دار طبقے سے تجارتی مقابلے میں کامیاب ہو۔ دوسرے لفظوں میں

وہ حاکم قوم کے مقابلے میں بازاروں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ جہاں وہ اپنا مال بیچ سکے۔ اس کے لئے سب سے پہلے اُس کی نظر خود اپنے ملک کے بازاروں پر پڑتی ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ سب سے پہلے خود اپنے ملک کے بازار ہمارے مال کے لئے مخصوص ہو جائیں اور حاکم قوم کے تجارتی مال ہمارے ملک کے بازاروں میں داخل نہ ہو سکیں۔ اس طرح قومی تحریک چل پڑتی ہے قومی تحریک میں بازاروں کا سوال ہی سب سے بنیادی اور اہم سوال ہوتا ہے۔ بازار ہی وہ پہلی درس گاہ ہے۔ جہاں سرمایہ دار طبقہ قومیّت کا سبق پڑھتا ہے۔

سامراجی ریاستیں

یورپ میں جب سرمایہ دارانہ نظام نے ترقی کی تو سرمایہ دار ملکوں کو نئے نئے بازاروں کی ضرورت محسوس ہوئی اور صنعتی اشیاء پیدا کرنے کے لئے کچے مال اور ایندھن کی تلاش شروع ہوئی۔ پھر سرمایہ دار ملکوں سے دوسرے ملکوں میں سرمایہ جانے لگا۔ اور اسے نئے نئے ملکوں میں کاروبار اور صنعت میں لگایا جانے لگا اسی کے ساتھ سرمایہ دار ملکوں کو ضرورت محسوس ہوئی۔ کہ نئے ملکوں کو جانے والے سمندری اور خشکی کے راستوں کی حفاظت کی جائے اس طرح مغربی یورپ کی پرانی قومی ریاستوں نے نئے علاقوں پر

قبضہ کیا - اور وہ کثیر القومی ریاستوں میں بدل گئیں۔ جیسا کہ ہمیشہ کثیر القومی ریاستوں کے اندر ہوتا ہے۔ ان ریاستوں میں بھی ایک قوم پر دوسری قوم کا ظلم و تشدد شروع ہوا اور ریاست کے اندر ہی مختلف قوموں کے درمیان تصادم ہونے لگا۔ برطانیہ فرانس، جرمنی اور اٹلی اسی قسم کی کثیر القومی ریاستوں[۱] کی مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ دوسری طرف جو پرانی کثیر القومی ریاستیں موجود تھیں۔ مثلاً روس، آسٹریا اور ہنگری ــــ انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ اپنے ریاستی نظام کو برقرار رکھنے اور کمزور قوموں کو بدستور محکوم بناتے رکھنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کے علاوہ انہوں نے اپنی سرحدوں کو بھی وسیع کرنا شروع کیا اور نئی قوموں کو محکوم بنانے پر آمادہ ہوئے مثلاً زار کے زمانے کے روس نے اپنے حدود کو وسیع کر کے اپنی ہمسایہ ریاستوں، ترکی اور ایران کے لئے خطرہ پیدا کیا۔
اس طرح قومیت کا مسئلہ اور بھی پھیل گیا اور آخر میں وہ نوآبادیات کے عام مسئلے کا ایک حصہ ہو گیا۔ پہلے تو یہ تھا کہ

---

[۱] گزشتہ عالمگیر جنگ کے بعد اٹلی اور جرمنی کثیر القومی ریاستیں نہیں ہیں (مؤلف)

ایک قوم پر دوسری قوم کے استحصال اور تشدد کا سوال کسی ریاست کا اندرونی سوال تھا۔ لیکن اب اس کی شکل بین الاقوامی ہو گئی اور وہ اس طرح کہ چونکہ ہر بڑی سامراجی طاقت کمزور قوموں کو محکوم بنانا چاہتی تھی۔ اس لئے خود ان سامراجی طاقتوں کے درمیان باہمی تصادم شروع ہو گیا۔ اس طرح پہلے ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت کا مسئلہ بڑھتے بڑھتے اور پھیلتے پھیلتے ایک ایسی منزل پر آ پہنچا۔ جب دنیا کی مختلف طاقتوں میں اسی مقصد کے لئے جنگ شروع ہو گئی۔ جس چیز کی حدیں پہلے ریاست کی سرحدوں تک محدود تھیں۔ وہی اب بین الاقوامی تصادم اور عالمگیر جنگ میں بدل گئیں ؎

قوموں کے حقِ خود ارادیت سے کیا مطلب ہے

خود ارادیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر قوم اپنے مستقبل کا تعیّن خود کرے اور کوئی دُوسری قوم بزور بازو دخل انداز ہونے کی کوشش نہ کرے۔ ایک قوم دوسری قوم کے تعلیمی اور دیگر اداروں کو تباہ و برباد نہ کرے۔ اس کے رسوم و رواج کو توڑنے کی کوشش نہ کرے۔ اس کی زبان کی اشاعت میں رکاوٹیں نہ ڈالے اور اُس کے حقوق پر پابندیاں عائد نہ کرے۔

یہاں پر استالن نے اس بات سے بحث کی ہے کہ قوموں کے حقِ خود ارادیت کے سلسلے میں سوشلسٹوں کا رویہ کیا ہونا چاہئے حقِ خود ارادیت

کی حمایت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سوشلسٹ کسی قوم کے ہر ادارے اور ہر رسم و رواج کی حمایت کریں۔ لیکن ان کا یہ فرض ضرور ہے کہ وہ ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم و تشدد کو ختم کرنے کی کوشش کریں لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اس قوم کے مُضر رسوم و رواج اور مُضر اداروں اور انجمنوں کے خلاف تحریک چلائیں۔ تاکہ اس قوم کے مزدور اور محنت کش طبقے کو اس قوم کے اوپری طبقوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا موقع ملے۔

حقِّ خود ارادیّت سے مُراد یہ ہے کہ ہر قوم اپنی زندگی کی ترتیب و تعمیر خود اپنی خواہش اور ارادے کے مطابق کرے۔ آزادی اور خود مختاری کی بنیاد پر اپنی قومی زندگی کی عمارت کھڑی کرے۔ اگر دوسری قوموں کے ساتھ مل کر وفاق قائم کرے تو خود اپنی خواہش سے کسی دباؤ کے تحت نہیں۔ پھر جب چاہے دوسری قوم سے مکمل علیحدگی اختیار کر لے۔ یہ ہیں حقِ خود ارادیّت کے عناصر۔

لیکن سوشلسٹوں کا رویّہ اس سلسلے میں یہ ہونا چاہئیے کہ وہ قوم کے ہر مطالبے کی حمایت کرنا شروع نہ کر دیں۔ مثال کے طور پر اگر حقِ خود ارادیت کے تحت کسی قوم کو یہ حق حاصل ہو کہ چاہے تو نئے نظام کو ختم کر کے اپنا پرانا نظام قائم کر دے۔ تو ایسے موقع پر سوشلسٹوں کا یہ فرض ہے کہ وہ

اس مطالبے کی مخالفت کریں! سوشلسٹ مزدور طبقے کے مفاد کے محافظ ہیں لیکن پوری قوم میں تمام طبقے شامل ہوتے ہیں۔ حقِ خود ارادیت کے سلسلے میں سوشلسٹوں اور سرمایہ دار طبقوں کے طرزِ عمل اور رجحانات میں جو فرق ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے۔ سوشلسٹ یہ چاہتے ہیں کہ غیر قوم کے ظلم و تشدد کو ختم کر دیا جائے۔ قوموں کے درمیان جو دشمنی کے اسباب پائے جاتے ہیں۔ ان کو ختم کرکے قومی دشمنی کی شدت میں ہر ممکن کمی کی جائے۔ برخلاف اس کے سرمایہ دار طبقہ دوسری قوموں سے دشمنی کو اور تیز کرنے اور قومی تحریک کو طویل اور شدید بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ سوشلسٹ قوموں کے باہمی تصادم کی شدت کو کم کرتے ہیں۔ سرمایہ دار طبقہ اسے اور تیز کر دیتا ہے۔ یہ ہے حقِ خود ارادیت کی تحریک کے سلسلے میں سرمایہ دار اور مزدور طبقے کی پالیسی کا فرق۔

ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی زندگی کی تعمیر بغیر کسی دوسری قوم کے دباؤ اور زبردستی کے آزادانہ طور پر خود اپنی خواہش اور آئیڈیل کے مطابق کرے۔ یعنی انہیں طریقوں کے مطابق جنہیں وہ اپنے لئے موزوں سمجھتی ہے لیکن اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ اس سلسلے میں اس قوم کو دوسری قوموں کے حقوق پر حاوی ہونے کا حق حاصل نہیں ہے۔ سوال یہاں پر یہ پیدا ہوتا ہے (اور جس کا سوشلسٹوں کو خاص طور پر خیال کرنا چاہیئے)

کہ کوئی قوم کس طرح اپنی زندگی کی ترتیب کرے اور اپنے دستورِ حکومت کو ایسی شکل عطا کرے کہ قوم کی اکثریت کے حقوق اور اس قوم کے مزدور طبقے کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ کوئی قوم اگر خود اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی کی ترتیب و تعمیر کرتی ہو تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اس قوم کا کم تعداد اعلیٰ طبقہ اکثریت اور مزدور طبقے کے حقوق کو اپنے مفاد کے خاطر پامال کرنے کی کوشش کرے۔ یہی بات ہے جس کا سوشلسٹوں کو خاص طور پر خیال رکھنا ہے۔

اب حقِ علیحدگی کا سوال لے لیجئے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر قوم کو علیحدگی کا حق حاصل ہونا چاہیئے لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر حال میں وہ علیحدہ ہو کر ہی رہے۔ جہاں تک کسی قوم کی اکثریت یعنی اس کے محنت کش طبقے کے مفاد کا سوال ہے۔ یہ بالکل طے شدہ امر ہے کہ ہر حال میں کسی قوم کی علیحدگی مفید نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر ٹرانس کاکیشیا کے تاتار بحیثیت قوم اپنی مجلس قانون ساز میں جمع ہوں۔ اور اپنے امیر بیگوں اور ملاؤں کے اثر میں آکر یہ فیصلہ کر بیٹھیں کہ سوویت اشترا کی ریاست سے علیحدگی اختیار کر لی جائے اور انقلاب سے پہلے کا پرانا نظام دوبارہ قائم کر دیا جائے۔ تو یہ فیصلہ تاتار قوم کے محنت کش طبقے کے لئے ہرگز مفید ثابت نہیں ہوگا۔ حالانکہ حقِ خود ارادیت کے مفہوم

کے مطابق ان کو یہ فیصلہ کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ ایسی حالت میں سوشلسٹوں کا رویہ کیا ہونا چاہیئے ظاہر ہے کہ وہ یہ سوچ کر کہ قوم اپنا حق خود ارادیت استعمال میں لا رہی ہے۔ خاموش اور الگ تھلگ نہیں بیٹھ سکتے۔ وہ ہرگز اس صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکتے کہ بیگ صاحبان اور ملّا صاحبان قومی مسئلے کو حل کرنے کے لیئے عوام کی رہنمائی اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ سوشلسٹوں کا فرض ہو گا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی بجائے حالات میں دخل انداز ہونے کی کوشش کریں اور قوم کے ارادے پر اثر انداز ہو کر اسے ایک ایسے راستے پر لے جائیں جس سے محنت کش طبقے کے مفاد کی حفاظت ہو سکے۔ انہیں ایسے موقع پر قومی مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک ایسے مخصوص پلان کے ساتھ میدانِ عمل میں آنا چاہیئے جو ہماری عوام کے لئے سب سے زیادہ مفید ہو۔ ایسے موقع پر انہیں اس بات کا تعین کرنا ہو گا کہ کونسی صورت محنت کش عوام کے لئے سب سے مفید ثابت ہو گی۔ ممکن ہے اندرونی خودمختاری یا وفاق یا مکمل علیحدگی کسی مخصوص صورتِ حال میں محنت کش عوام کے نقطہ نظر سے مکمل علیحدگی کے مقابلے میں زیادہ مفید ثابت ہو۔ یا پھر ایسے حالات بھی ہو سکتے ہیں کہ محنت کش عوام کی حفاظت کے لئے مکمل علیحدگی کا راستہ سب سے کارآمد ثابت ہو۔ غرض ان باتوں کا فیصلہ ہر قوم کے مخصوص تاریخی حالات پر منحصر ہے۔ وہ مخصوص تاریخی حالات ساکن

اور جامد نہیں ہوتے بلکہ دنیا کی ہر شے کی طرح مسلسل طور پر بدلتے رہتے ہیں چنانچہ آج ہم جو فیصلہ کریں گے ممکن ہے آگے چل کر وہ بالکل غیر موزوں اور غلط ثابت ہو۔ قومی مسئلے کا حل اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم تاریخی حالات کا ان کی ٹھہری ہوئی شکل میں نہیں بلکہ بدلتی ہوئی شکل میں مطالعہ کریں۔ کوئی قوم کس طرح اپنی زندگی کی ترتیب کرے اور اس کے دستورِ حکومت کی شکل کیا ہو؟ ان مسائل کا حل اس قوم کے معاشی، سیاسی اور تہذیبی حالات میں ہی مل سکتا ہے۔

غرض جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ قوموں کی حقِ علیحدگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی قوم ہر حال میں علیحدہ ہو کر ہی رہے۔ واقعی علیحدہ ہونے کا سوال مزدوروں کی جماعت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ مزدوروں کی ہر جماعت ہر قوم کے مخصوص حالات کے تحت یہ فیصلہ کرے کہ اس قوم کو علیحدہ ہو جانا چاہیئے یا نہیں۔ جب ہم محکوم قوموں کے حقِ علیحدگی کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ ہر قوم کو اپنا مستقبل متعین کرنے کا حق حاصل ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اسی وقت یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ فلاں قوم روسی ریاست سے یقیناً اور فوری طور پر علیحدہ ہو جائے۔ ہم ہر قوم کے حقِ علیحدگی کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ہم زبردستی کسی قوم کو علیحدہ ہو جانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ ہر قوم کو علیحدگی کا حق حاصل ہے۔ لیکن

اس بات کا فیصلہ خود وہی قوم کر سکتی ہے کہ مخصوص حالات کے تحت وہ واقعی علیحدہ ہو جانا چاہتی ہے یا نہیں۔ ہمیں اختیار حاصل ہے کہ مزدور طبقے کے مفاد کا خیال کرتے ہوئے علیحدگی کے خلاف

یا اس کی حمایت میں اپنی آواز بلند کریں۔ ہر قوم کے ساتھ علیحدہ علیحدہ طور پر یہ فیصلہ کیا جائے کہ اس قوم کو اس کے مخصوص تاریخی حالات کے تحت علیحدگی اختیار کرنی چاہیئے یا نہیں چنانچہ حق علیحدگی کو تسلیم کرنا اور بات ہے اور ہر حال میں لازمی طور پر کسی قوم کا علیحدہ ہو جانا اور بات۔ ان دو باتوں کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیئے۔ مثلاً میں (یعنی اسٹالن) ذاتی طور پر ٹرانس کاکیشیا کی علیحدگی کی مخالفت کروں گا۔ اس لیئے کہ ایسے موقع پر میرے ذہن میں مندرجہ ذیل باتیں ہوں گی۔ روس ترقی کی ایک بلند سطح پر پہنچ چکا ہے اور ٹرانس کاکیشیا بہت بچھڑا ہوا ہے۔ پھر میں یہ بھی دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ ٹرانس کاکیشیا میں مزدور طبقے کی جدوجہد کسی حد تک کامیاب ہو سکی ہے۔ غرض ٹرانس کاکیشیا کی علیحدگی کے سوال پر میرے ذہن میں یہ تمام باتیں ہوں گی لیکن اگر پھر بھی ٹرانس کاکیشیا کی قومیں علیحدگی کا فیصلہ کریں تو وہ یقیناً علیحدہ ہو کر رہیں گی اور ہماری طرف سے ان کی کوئی مخالفت نہ ہو گی۔

قومی تحریکیں

محکوم قوم کا سرمایہ دار طبقہ ہر طرف کے دباؤ سے مجبور ہو کر قومی تحریک شروع کرتا ہے۔ وہ اپنے ہموطنوں سے اپیل کرتا ہے اور مادرِ وطن کے نعرے لگاتا ہے۔ وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے اغراض بحیثیت مجموعی پوری قوم کے اغراض ہیں۔ یہ طبقہ اپنے لئے یا اپنی مقصد براری کے لئے اپنے ہم وطنوں کی اعانت سے ایک تحریک اور ایک جماعت پیدا کرتا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا مقصد مادرِ وطن کو فائدہ پہنچانا ہے۔ عوام بھی سرمایہ دار طبقے کی آواز پہ کان دھرتے ہیں اور قومی جھنڈے تلے جمع ہو جاتے ہیں۔ اوپر سے جتنا بھی ظلم و دباؤ ان پر ہوتا ہے۔ اس قدر

اُبھرتے ہیں اور ان کے اندر بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح قومی تحریک چل پڑتی ہے۔ توہم کا جتنا ہی بڑا حصہ دوسرے لفظوں میں مزدوروں، کسانوں کی جتنی بڑی تعداد قومی تحریک میں شامل ہوتی ہے اسی قدر وہ قومی تحریک مضبوط ہوتی ہے۔ مزدور طبقے کا سرمایہ داروں کی قومی تحریک میں شامل ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ اس ملک کے سماج میں طبقاتی اختلافات کس حد تک ترقی کر سکے ہیں۔ مزدور طبقے میں کتنا طبقاتی شعور پیدا ہوا ہے اور وہ کس حد تک منظم ہیں جس ملک کے مزدور طبقے کا طبقاتی شعور بہت تیز ہو چکا ہوتا ہے۔ وہاں اس کی اپنی الگ جماعت اور الگ جھنڈا ہوتا ہے۔ اسے سرمایہ دار طبقے کے جھنڈے تلے جمع ہونے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔

جہاں تک کسانوں کا تعلق ہے۔ قومی تحریک میں ان کے ساتھ شامل ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان پر کس قسم کا دباؤ اور تشدد کیا جا رہا ہے۔ اگر ان پر دباؤ زمین کے سلسلے میں ہے۔ جیسا کہ آئرلینڈ میں تھا۔ تو کسانوں کی بہت بڑی تعداد فوراً قومی تحریک میں شامل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف جارجیا کی مثال لیجئے۔ جارجیا میں روسی زمیندار طبقہ یا کوئی روسی اعلیٰ سرمایہ دار طبقہ موجود نہیں تھا۔ جس کے خلاف وہاں کی قومی تحریک صف آرا ہوتی۔ اسی لئے جارجیا

میں روس کے خلاف کوئی خاص طور پر قومی تحریک نہیں پائی جاتی تھی لیکن جارجیا میں آرمینیا کے خلاف ضرور تحریک پائی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جارجیا میں ایک آرمینیائی اعلےٰ سرمایہ دار طبقہ موجود تھا جس نے وہاں کے غیر مستحکم اور چھوٹے سرمایہ دار طبقے کو دبا رکھا تھا۔

انہیں عناصر کا سہارا لیکر یعنی مزدوروں اور کسانوں اور سرمایہ دار طبقے کا سہارا لے کر قومی تحریک آگے بڑھتی ہے اور یا تو ایک عوامی قومی تحریک کی شکل اختیار کر لیتی ہے جیسا کہ آئرلینڈ اور گیلیشیا میں ہوا۔ یا چھوٹے چھوٹے جھگڑوں میں بدل جاتی ہے جو مسلسل طور پر واقع ہوتے رہتے ہیں۔ مؤخر الذکر صورت میں تحریک خراب ہو کر سائن بورڈ کے جھگڑوں پر آ کر ختم ہو جاتی ہے جیسا کہ بوہیمیا کے کچھ قصبوں میں ہوا۔ ہر جگہ قومی تحریک کی ماہیت اور نوعیت یکساں نہیں ہوتی۔ اس کی ماہیت کا اندازہ لگانے کے لئے ہمیں ان مطالبوں پر نظر ڈالنی چاہئے جو قومی تحریک چلانے والے پیش کرتے ہیں۔ جیسے آئرلینڈ کی قومی تحریک زرعی اور وہی مطالبوں پر مبنی تھی۔ بوہیمیا میں قومی تحریک چلانے والوں کا مطالبہ زبان سے تعلق رکھتا تھا۔ بعض جگہ قومی تحریک کا مقصد شہری مساوات اور مذہبی آزادی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ بعض جگہ قومی تحریک چلانے والے صرف یہ مطالبہ پیش کرتے ہیں کہ سرکاری عہدوں پر خود ہمارے حکام اور افسر مقرر کئے

جائیں اور خود ہماری اسمبلی قائم کی جائے۔ مطالبوں کا مختلف اور الگ الگ ہونا ان مختلف خصوصیات کو ظاہر کرتا ہے جن سے عام طور پر کوئی قوم متصف ہوتی ہے۔ مثلاً زبان علاقہ وغیرہ وغیرہ۔

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہوگی۔ کہ سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی کے زمانے میں جو قومی تحریک قائم ہوتی ہے وہ دراصل سرمایہ دار طبقوں کی باہمی جنگ ہوتی ہے۔ یعنی ایک سرمایہ دار طبقہ دوسرے سرمایہ دار طبقے کے اقتدار کو ختم کرنا چاہتا ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ محکوم سرمایہ دار طبقہ جو حاکم سرمایہ دار طبقے کے خلاف جدوجہد شروع کرتا ہے۔ وہ اپنی قوم کے مزدور طبقے کو بھی قومی تحریک کے اندر کھینچ لاتا ہے۔ ایسے مواقع پر یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ وہ تحریک صحیح معنوں میں پوری قوم کی تحریک ہے نہ کہ صرف سرمایہ دار طبقے کی۔ لیکن ایسا صرف باہر سے معلوم ہوتا ہے۔ باہر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قومی تحریک میں قوم کے تمام طبقے شامل ہیں لیکن دراصل وہ قومی تحریک ہمیشہ سرمایہ دار طبقے ہی کی تحریک ہوتی ہے اور اس تحریک سے مخصوص طور پر سرمایہ دار طبقے ہی کو فائدہ پہنچتا ہے

لیکن یہاں پر ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ قومی تحریک سے مزدور طبقہ کوئی ہمدردی نہ رکھے۔ یہ ایک بالکل واضح بات ہے کہ محکوم قوم کے مزدور طبقے کو

اپنی قوم کے سرمایہ دار طبقے کے ساتھ مل کر حاکم قوم کے سرمایہ دار طبقے کے ظلم و تشدّد کے خلاف ضرور جدوجہد کرتی ہے۔ اس لئے کہ محکوم قوم کے سرمایہ دار طبقے پر حاکم قوم کا جتنا ہی تشدّد ہوتا ہے۔ . . . .

. . . . اتنا ہی محکوم قوم کا مزدور طبقہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ آمد و رفت پر پابندی لگانا ووٹ دینے کے حق سے محروم رکھنا۔ قومی زبان کو ختم کر دینے کی کوشش کرنا، قومی درسگاہوں پر پابندیاں لگانا، تشدّد اور دباؤ کی دوسری شکلیں اختیار کرنا ــــ یہ تمام مظالم جو حاکم قوم کی طرف سے ڈھائے جاتے ہیں۔ ان سے محکوم قوم کا سرمایہ دار طبقہ بھی متاثر ہوتا ہے اور مزدور طبقہ بھی۔ ان پابندیوں سے محکوم قوم کے مزدور طبقے کی ذہنی ترقیوں میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ تاتار یا یہودی مزدوروں کی دماغی صلاحیتیں اسی وقت پھل پھول سکتی ہیں جب وقت اُنہیں اپنے جلسوں اور تقریروں میں اپنی مادری زبان کے استعمال کرنے اور خود اپنی درسگاہیں قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔

غیر قوم کے دباؤ سے مزدور طبقے کے لئے ایک اور خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ جب پوری قوم پر کسی غیر قوم کا ظلم و تشدّد ہو رہا ہوتا ہے تو سب کی توجہ قوم کے اندرونی سماجی مسائل اور طبقاتی جدوجہد کے سوالات سے ہٹ کر قومی سوالات میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ تمام لوگوں کی توجہ

مخصوص طور پر ان مسائل میں الجھ جاتی ہے جن کا تعلق مزدور اور سرمایہ دار دونوں سے ہوتا ہے۔ مزدور طبقہ غیر قوم کے خلاف جدوجہد کے سلسلے میں یہ بھول جاتا ہے کہ ہمیں خود اپنی قوم کے سرمایہ دار طبقے سے بھی جنگ کرنی ہے۔ ایسی فضا میں سرمایہ دار طبقے کا یہ جھوٹا پروپیگنڈہ کامیاب ہوتا ہے کہ مزدور اور سرمایہ دار طبقے کے مفاد میں ہم آہنگی اور مطابقت ہے۔ مزدور طبقے کے اپنے خاص مفادات پر پردہ پڑ جاتا ہے اور مزدور کو ذہنی اعتبار سے غلام بنا لیا جاتا ہے۔ ایسی فضا میں تمام قوموں کے مزدور طبقے کو باہم متحد کرنے میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ پولینڈ کے مزدوروں کے خاصے بڑے حصے کے دماغ پر ابھی تک وہاں کے سرمایہ دار قوم پرستوں کا قبضہ ہے اور وہ ابھی تک بین الاقوامی مزدور تحریک سے علیحدہ ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ غیر قوموں نے ایک طویل مدت تک پولینڈ پر حکومت کی ہے اور وہاں ایسی فضا تیار کر دی ہے کہ غیر قوموں کے ظلم و تشدد اور محکومی کے خلاف وہاں کے تمام طبقے متحد ہو گئے ہیں اور وہاں کے مزدور قومی جدوجہد کے سلسلے میں یہ بھول گئے ہیں کہ ہمیں خود پولینڈ کے سرمایہ داروں کے خلاف بھی جنگ کرنی ہے۔ اس طرح وہاں کے مزدوروں کے دماغ پر سرمایہ دار قوم پرستوں کا قبضہ ہے۔ اس محکومی کی حالت میں

خود مزدور طبقے کا سراسر نقصان ہے۔ اس لئے انہیں بھی غیر ملکی حکومت کے خلاف پوری جدوجہد کرنی چاہیئے ـــــــ

مزدوروں کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا کے مزدور ایک واحد بین الاقوامی جماعت میں پورے طور پر متحد اور منسلک ہو جائیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پورا مزدور طبقہ جلد از جلد مکمل طور پر سرمایہ دار ذہنی محکومی سے آزاد ہو جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر ملک کے مزدور غیر قوموں کے ظلم و تشدد کے خلاف جنگ کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مزدور طبقے کا یہ بھی فرض ہے کہ سرمایہ دار طبقے کے مقابلے پر مختلف قوموں کو ایک دوسرے کے خلاف ابھارنے کی پالیسی اختیار نہ کریں ـــــــ

قومی تحریکوں کا انقلابی کردار

اگر کوئی قومی تحریک غیر ملکی سامراج کے خلاف جدوجہد کر رہی ہے تو اس کے انقلابی ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں مزدور طبقے کے لوگ بھی شامل ہوں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ تحریک کسی انقلابی یا جمہوری پروگرام کے مطابق چل رہی ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ تحریک جمہوری بنیادوں پر قائم ہو، مثلاً امیر افغانستان اس[1] وقت اپنے ملک کی آزادی کے لئے برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔ امیر

---

[1] استالین کی جس تصنیف سے یہ اقتباسات لئے گئے ہیں وہ بہت پہلے کی ہے۔

اور اُس کے ساتھیوں کے خیالات شاہ پسندانہ ہیں اور وہ جمہوریّت کے قیام کی بجائے شخصی حکومت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس سے قطع نظر ہم اس جدوجہد کو انقلابی جدوجہد سمجھتے ہیں کیوں؟ اسلئے کہ اس سے برطانوی سامراج کی جڑیں کمزور ہوتی ہیں اور یہ اُمید پیدا ہوتی ہے کہ افغانستان کی آزادی کی تحریک چاہے بادشاہی کے ہاتھ میں کیوں نہ ہو، کامیاب ہو کہ برطانوی سامراج کو کمزور کریگی۔ لیکن دُوسری طرف کرنسکی رینوڈیل، چرنوف، ڈائن، ہنڈرسن اور کلائنٹ وغیرہ جیسے جمہوریت پسندوں اشتراکیوں، اور انقلابیوں کی مثالیں لے لیجئے۔ ان لوگوں نے جو جدوجہد کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سامراج کی فتح ہوتی اور اُس کے قدم پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گئے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے جمہوریت پسند اور اشتراکیت پسند ہونے کے باوجود تحریک ہرگز انقلابی نہیں تھی۔ مصر کے تاجر اور سرمایہ دار اہلِ علم اپنے مُلک کی آزادی کے لیے جو جدوجہد کر رہے ہیں۔ وُہ انقلابی ہے۔ اس لئے کہ اس کی کامیابی میں برطانوی سامراج کی تباہی مضمر ہے۔ اگرچہ مصر کی آزادی کی تحریک سرمایہ دار طبقے کے لوگ چلا رہے ہیں جو اشتراکیت کے سخت مخالف ہیں۔ اس کے برخلاف برطانیہ کی مزدور (لیبر) حکومت مصر کو دائمی طور پر محکوم رکھنے کے لئے جو جدوجہد کر رہی ہے۔ وُہ سراسر ترقی دشمنی اور رجعت پرستی پر مبنی ہے۔

اگرچہ برطانیہ کی مزدور حکومت کے ممبروں کا تعلق مزدور طبقے سے ہے۔ جو اشتراکیت کا بھی حامی ہے۔ لینن نے کہا تھا کہ قومی تحریکوں کے بارے میں یہ قائم کرنے کے لیئے کہ وہ انقلابی ہے یا غیر انقلابی۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم محض ان کی ظاہری جمہوریت کو نہ دیکھیں بلکہ ان کو اس نظر سے دیکھیں کہ سامراجی حکومتوں کے خلاف ساری دنیا میں جو جنگ جاری ہے۔ اسمیں ان تحریکوں سے مدد ملتی ہے یا نہیں اور اسے فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں۔ اگر کسی قومی تحریک سے سامراج کے خلاف عالمگیر تحریک میں مدد ملتی ہے تو وہ قومی تحریک یقیناً انقلابی ہے اور اگر نقصان پہنچتا ہے۔ تو غیر انقلابی چاہے اس قومی تحریک کی باگ ڈور اشتراکیوں اور جمہوریوں کے ہاتھوں میں ہو یا سرمایہ داروں اور شاہ پسندوں کے ہاتھوں میں ہم کسی قومی تحریک کو پوری دنیا کے عام نقشے سے الگ نہیں کر سکتے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہر قومی تحریک کو عالمگیر صورتِ حال کے پس منظر میں رکھ کر اس کے بارے میں رائے قائم کریں +

سرمایہ داری اور قومی مسئلہ

گذشتہ صدی میں سرمایہ دارانہ نظام کے عروج سے دنیا میں ایک زبردست تبدیلی پیدا ہوئی اسی نظام کی ترقی سے اشیاء کی پیدائش اور تجارتی لین دین کے ذرائع پر بین الاقوامی نگرانی قائم کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ اس سے پہلے قومیں زیادہ تر ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہ کر زندگی گزارتی تھیں لیکن وہ بات ختم ہوئی اور دنیا کی قومیں معاشی رشتوں میں منسلک ہو گئیں بڑے بڑے علاقے واحد علاقوں میں مدغم ہونا شروع ہوئے۔ دنیا کے بازاروں کی توسیع اور ترقی ہوئی اور ہر ملک کا تجارتی مال ملکی حدود سے باہر نکل کر دُور دراز ملکوں میں پہنچنے لگا۔ بری اور بحری راستوں سے آمد و رفت

ہونے لگی۔ سرمایہ دار ملکوں سے سرمایہ نکل کر دوسرے ملکوں میں پہنچنے لگا ان تمام چیزوں نے مل کر بین الاقوامیت کے رجحان کو آگے بڑھایا اور مختلف قوموں کو بین الاقوامی تقسیم محنت اور عالمگیر امداد باہمی کے بندھنوں میں جکڑ دیا۔ بین الاقوامی تقسیم محنت سے مُراد یہ ہے کہ اگر انگلستان پہلے اپنی ضروریات کی تمام چیزیں خود پیدا کر لیتا تھا تو اب یہ ہو گیا کہ انگلستان زیادہ صرف صنعتی اشیاء پیدا کرنے لگا اور ان اشیاء کو ہندوستان میں بیچ کر یہاں سے اپنی ضروریات کی دوسری چیزیں خریدنے لگا۔ اسی طرح ہندوستان اپنا کچا مال اور غذا انگلستان میں بھیجکر وہاں سے اپنی ضروریات کی صنعتی چیزیں خریدنے لگا۔ اسی طرح اور ملکوں کے ساتھ بھی ہوا۔

اس بین الاقوامی رجحان کے دو پہلو تھے۔ ایک اچھا اور دوسرا بُرا۔ اچھا پہلو تو یہ تھا کہ پیدائشِ اشیا میں عظیم ترقی ہوئی اور انسان نے اپنے آرام اور ضرورت کی چیزیں پیدا کرنے کی قوت اور صلاحیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھالی۔ قوموں کے علیحدہ علیحدہ رہنے کا رجحان دور ہوا۔ مختلف قوموں کے مفاد میں جو اختلاف اور تضاد موجود تھا۔ وہ ختم ہوا اور ایک قوم دوسری قوم کی حاجتمند بن گئی۔ یہ تمام باتیں اچھے پہلو کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس لئے کہ اس سے مستقبل کے عالمگیر اشتراکی طرز کے معاشی نظام کے لئے زمین تیار ہوتی ہے۔

لیکن اس بین الاقوامی رجحان کا برا پہلو بھی ہے جس کی تشریح یوں ہے کہ یہ رجحان جس طرز سے اور جن مخصوص شکلوں میں پیدا ہوا اور آگے بڑھا، وہ کچھ اچھی نہیں تھیں اور وہ اس لئے کہ یہ سب کچھ جس دور میں ہوا۔ وہ سرمایہ داری کا دور تھا۔ اگر قومیں ایک دوسرے سے قریب آئیں اور مختلف علاقے معاشی لحاظ سے آپس میں منسلک اور متحد ہوئے تو ایسے زمانے میں جو سرمایہ داری کے عروج اور ارتقا کا زمانہ تھا۔ قوموں میں تعاون اور اشتراکِ عمل ضرور قائم ہوا۔ لیکن افسوس کہ وہ قومیں مساوی حیثیت کی مالک نہیں تھیں۔ چنانچہ اس تعاون اور اشتراکِ عمل کے سلسلے میں کچھ قوموں پر دوسری قوموں کی حکومت قائم ہو گئی۔ زیادہ ترقی یافتہ قوموں نے پچھڑی ہوئی قوموں کو لوٹنا کھسوٹنا شروع کیا۔ یہ تھی بین الاقوامیت اور مختلف قوموں کے اشتراک کی وہ مخصوص شکل جو سرمایہ داری کے زمانے میں وجود میں آئی۔ نو آبادیات کا اچھی طرح استحصال کیا گیا اور ان کو طاقتور سرمایہ دار ریاستوں نے زبردستی اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔ ایک قوم کا دوسری قوم پر ظلم شروع ہوا اور نابرابری پیدا ہوئی۔ سامراجی ظلم و تشدد اور من مانی حکومت قائم ہوئی۔ نو آبادیات کو غلام بنایا گیا۔ ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت قائم ہوئی۔ "غیر متمدن" قوموں پر حکومت کرنے کے لئے "متمدن" قوموں کے درمیان مقابلہ شروع ہوا۔ یہ تھیں وہ شکلیں جو قوموں کے معاشی تعلقات نے

اختیار کیں۔ ان اسباب کی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ قومیں ایک دوسرے سے قریب ضرور آئیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ جن تشدد آمیز شکلوں میں وہ ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ ان کو تباہ و برباد کر دینے کا رجحان پیدا ہوا۔ یعنی نو آبادیات کے ستم رسیدہ عوام اور محکوم قوموں نے سامراجی غلامی سے نجات پانے کے لئے جد و جہد شروع کی۔ یہ رجحان اس حد تک تو اچھا ہے کہ دنیا کی قومیں جس تشدد آمیز انداز سے ایک دوسرے کے قریب لائی گئی ہیں۔ وہ ختم ہو۔ محکوم قوموں اور نو آبادیات کے عوام سامراج کے خلاف بغاوت کریں اور اس کے بعد قومیں زور بازو یا استحصال کے ذریعے نہیں۔ بلکہ مساوات کی بنیاد پر اور خود اپنی خواہش سے ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ یہ رجحان مستقبل کے عالمگیر اشتراکی معاشی نظام کے لئے نفسیاتی حالات اور فضا پیدا کر رہا ہے۔

ان دو مخصوص رجحانات کے درمیان تصادم کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔ کثیر القومی سامراجی ریاستوں مثلاً برطانیہ اور فرانس کی جو تاریخ رہی ہے وہ اس قسم کے تصادم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ یہ تصادم اور تضاد اس وقت تک دور نہیں ہو سکتا۔ جب تک سرمایہ دارانہ نظام موجود ہے اسی وجہ سے یہ کثیر القومی سامراجی ریاستیں داخلی طور پر دیوالیہ پن اور ایک زبردست اندرونی کمزوری کی شکار ہیں۔ ان کے اندر کبھی پائداری نہیں آ سکتی

ان کے اس بنیادی تضاد سے جو نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ ہر سرمایہ دار کثیر القومی ریاست کے اندر تصادم اور جھگڑے موجود ہیں۔ پھر سرمایہ دار ریاستیں باہمی طور پر جنگ آزما ہیں۔ پرانی نو آبادیاتی ریاستیں ٹوٹ اور بکھر رہی ہیں اور نئی نو آبادیاتی ریاستیں قائم ہو رہی ہیں۔ سامراجی ریاستوں کے درمیان نو آبادیات پر قبضہ کرنے کے لئے ایک نئی جدوجہد شروع ہو رہی ہے ۔۔۔۔ ایسی جنگوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کثیر القومی ریاستیں ٹوٹنے اور بکھرنے لگتی ہیں اور دنیا کے نئے سیاسی نقشے بنائے جاتے ہیں۔ پرانی ریاستوں کا ٹوٹ کر بکھر جانا۔ آسٹریا ہنگری کا ختم ہو جانا۔ ترکی کا زوال پذیر ہونا کے واقعات ایک طرف ہیں اور دوسری طرف برطانیہ اور پرانے جرمنی کی تاریخ ہمارے پیش نظر ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء تا سنہ ۱۹۱۹ء کی سامراجی جنگِ عظیم اور نو آبادیات اور محکوم قوموں میں انقلابی تحریکوں کے وجود میں آنے والے تمام واقعات اور اسی قسم کے دوسرے واقعات صاف طور پر ثابت کرتے ہیں کہ کثیر القومی سامراجی ریاستیں کس قدر غیر مستحکم اور اندرونی طور پر کتنی کمزور ہیں۔

ایک طرف تو قوموں کے درمیان معاشی ربط و اتحاد وجود میں آیا۔ تو دوسری طرف سامراجی ریاستوں نے اس ربط و اتحاد کو وجود میں لانے کیلئے استحصال کا طریقہ اختیار کیا۔ ان دو چیزوں کے درمیان تضاد کی صورت پیدا

ہو رہی ہے۔ اسی تضاد کی وجہ سے سرمایہ دار طبقہ قومی مسئلے کو حل کرنے میں بالکل ناکام رہا۔ اس نے اس مسئلے کو حل کرنے کی بجائے پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ اور شدت آمیز بنا دیا ہے۔ قومی مسئلہ نوآبادیاتی مسئلہ بن گیا ہے اور آئرلینڈ سے لیکر ہندوستان تک سامراج کے خلاف ایک نیا محاذ بن گیا ہے۔ قومی مسئلے کو اگر کوئی ریاست حل کر سکتی ہے تو وہ صرف ایسی ریاست ہے جس میں اشیا کی پیدائش کے آلات اور ذرائع پر اجتماعی ملکیت قائم ہو۔ صرف اشتراکی طرز کی ریاست ہی قومی مسئلے کو حل کر سکتی ہے۔ سوویٹ وفاقی ریاست میں اب مظلوم قوموں اور حکمران قوموں کا وجود نہیں رہا اور ایک قوم پر دوسری قوم کا ظلم و تشدد بھی ختم ہو گیا۔ لیکن چونکہ پرانے نظام کی لعنت کے نتیجے کے طور پر کم متمدن قوموں اور زیادہ متمدن قوموں کے درمیان تہذیبی، معاشی اور سیاسی لحاظ سے نابرابری پائی جاتی ہے۔ اس لئے قومی مسئلے کا مطالبہ ہے کہ ایسی کاروائیاں کی جائیں کہ سوویٹ نظام کے پچھڑی ہوئی قوموں کے محنت کش عوام معاشی، سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے ترقی کریں اور انہیں سوویٹ ریاست کی زیادہ ترقی یافتہ قوم یعنی روسی قوم کے برابر ہونے کا موقع ملے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا انتشار

اور اشتراکی نظام کا اتحاد

چونکہ سرمایہ داری کی بنیاد ذاتی ملکیت اور استحصال پر قائم ہے۔ اس لئے وہ قوموں کے درمیان نفاق اور پھوٹ پیدا کرتی ہے اور ان کو حریف جماعتوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ اس کی مثال ہمیں برطانیہ اور فرانس میں ملتی ہے، بلکہ وہ بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ جیسے پولینڈ اور یوگوسلاویہ جو اندرونی قومی اختلافات کے شکار ہیں، یہ اختلافات ان ریاستوں کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتے رہتے ہیں۔ مغرب میں جہاں سرمایہ دارانہ جمہوریت کا رواج ہے اور جہاں ریاستوں کی بنیاد ذاتی ملکیت پر قائم ہے۔ وہاں قومی دشمنی قومی جھگڑوں اور قومی جدوجہد کا پیدا ہونا

لازمی امر ہے۔ برخلاف اس کے سوویٹ نظام میں سیاسی طاقت سرمایے پر قائم نہیں ہے بلکہ محنت پر یقینی سیاسی طاقت مزدوروں کے ہاتھ میں ہے نہ کہ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں۔ اس کی بنیاد ذاتی ملکیت پر نہیں بلکہ اجتماعی ملکیت پر ہے۔ وہ سیاسی طاقت انسان پر انسان کے استحصال سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس استحصال کی مخالفت اور دشمنی سے۔ سوویٹ حکومت میں جو سیاسی طاقت ہے۔ اس کی ماہیت اور فطرت ہی محنت کش عوام کو اتحاد کی طرف لے جاتی ہے اور ان کو ایک واحد اشتراکی خاندان میں منسلک اور متحد کر دیتی ہے۔ یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ مغرب کی سرمایہ دار جمہوری کثیر القومی ریاستیں رفتہ رفتہ منتشر اور زوال پذیر ہو کر مختلف حصّوں اور ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی ہیں۔ برطانیہ کی مثال پر نظر ڈالئے۔ ہندوستان اور مصر آئرلینڈ کے آزاد ہو جانے پر سلطنت برطانیہ کا شیرازہ بکھر جائیگا اور یہ لازمی ہے کہ برطانیہ کو ان تینوں ملکوں سے کوئی نہ کوئی معاملہ طے کرنا ہوگا۔ پولینڈ کو بھی متعدد قوموں سے نبٹنا ہے جیسے سفید روسی۔ یوکرینی، جرمن اور یہودی، لیکن سوویٹ وفاق میں جس میں تیس سے کم قومیں شامل نہیں ہیں ہمیں بالکل برعکس صورت حال دکھائی دیتی ہے۔ یہاں مختلف آزاد ریاستوں کے درمیان سیاسی اتحاد اور استحکام بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس عمل کے تحت آزاد قومیں

ایک واحد آزاد ریاست میں بدل رہی ہیں۔ اس طرح ہمیں دو قسم کے سیاسی اتحادوں کا نقشہ ملتا ہے۔ ایک طرف تو سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ جو ایک ہی ریاست کے اندر بسنے والی مختلف قوموں کو الگ الگ کر دیتا ہے اور ریاست مختلف حصّوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف سوویٹ طرز کا سیاسی اتحاد ہے جو آزاد علیحدہ علیحدہ قوموں کے درمیان بتدریج لیکن مضبوط ربط پیدا کر کے ایک واحد آزاد ریاست کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔

سبب جاننا مشکل نہیں ہے۔ ذاتی ملکیّت اور سرمایہ عوام میں نفاق کے بیج بوتا ہے۔ قومی دشمنی کی آگ کو ہوا دیتا ہے اور ایک قوم پر دوسری قوم کا ظلم قائم کرتا ہے۔ اس کے برخلاف اجتماعی ملکیّت اور اجتماعی محنت عوام کو متحد کرتی ہے اور ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم کو ختم کرتی ہے جس طرح سرمایہ داری سے لازماً ایک قوم پر دوسری قوم کا ظلم پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح اشتراکیت سے لازمی طور پر محکوم قومیں حاکم قوموں کے پنجے سے آزاد ہوتی ہیں اور ہر قوم کو آزادی نصیب ہوتی ہے۔ جب تک کسان طبقے اور عام چھوٹے سرمایہ دار طبقے کے لوگوں میں قومی توہمات باقی رہیں گے اور جب تک وہ سرمایہ دار طبقے کے پیچھے پیچھے چلتے رہیں گے اس وقت تک جاہلانہ وطن پرستی اور مختلف قوموں میں باہمی تصادم پیدا

ہوتا رہے گا۔ برخلاف اس کے اگر کسان مزدوروں کی رہنمائی قبول کر لیں یعنی اگر مزدوروں کی آمریت قائم ہو جائے تو مختلف قوموں کے درمیان امن وامان کا پیدا ہونا اور قومی آزادی کا وجود میں آنا ایک بالکل یقینی امر ہے۔ چنانچہ ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم وتشدّد کو ختم کرنے کی بنیادی صورت یہ ہے کہ مزدور راج قائم ہو۔ اسی سے قوموں میں مساوات اور برابری قائم ہو گی اور قومی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ہو سکے گی۔

روس کے اشتراکی انقلاب کے تجربے سے اوپر لکھی ہوئی باتیں سچ ثابت ہوتی ہیں۔ روس میں جب سوویٹ نظام قائم ہوا اور یہ اعلان کیا گیا کہ ہر قوم کو سیاسی علیحدگی کا حق حاصل ہے تو روس کے محنت کش عوام کے درمیان پرانے تعلقات ختم ہو گئے اور نئے تعلقات قائم ہوئے وہاں کی قوموں کی پرانی دشمنی کی جڑیں کھوکھلی ہو گئیں۔ قومی ظلم وتشدّد کا خاتمہ ہوا۔ روس کے مزدوروں کا اعتماد وہاں کی دوسری قوموں کے دل میں بیٹھ گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ یورپ اور ایشیا کے مزدوروں کے دل میں بھی یہ اعتماد اتنا بڑھا کہ آج تمام ملکوں کے مزدور مشترکہ مقصد کے لئے متحد ہو کر جدوجہد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جب آذر بائیجان اور آرمینیا میں سوویٹ ریاستیں قائم ہوئیں تو وہاں بھی اسی قسم کے نتائج پیدا ہوئے۔ پہلے ان ریاستوں میں سے ہر ریاست کے اندر مختلف

قومیں ایک دوسرے سے متصادم رہتی تھیں لیکن سوویٹ نظام قائم ہونے کے بعد ترکی اور آرمینیا کے محنت کش عوام میں جو صدیوں کی دشمنی تھی ختم ہو گئی۔ آرمینیا اور آذربائیجان کے عوام کی دشمنی بھی ختم ہو گئی ہینگری، بیویریا، فن لینڈ اور لیٹویا، میں سوویٹ نظام کو مستقل نہیں بلکہ محض کچھ دنوں کے لئے کامیابی حاصل ہوئی لیکن اسکے باوجود وہاں بھی اسی قسم کے نتائج ظاہر ہوئے۔ یعنی وہاں بسنے والی مختلف قوموں کا باہمی تصادم فوراً ڈھیلا پڑ گیا۔ اگر خود روس میں ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم و تشدد کا خاتمہ نہ کر دیا جاتا اور مختلف قوموں کی آپس کی دشمنی کو نہ مٹا دیا جاتا اور اگر مغرب و مشرق کی قوموں کے محنت کش عوام روس کے مزدوروں کے ساتھ اپنی پر جوش ہمدردی اور اعتماد نہ ظاہر کرتے تو روس کے مزدور کبھی بھی کولچک، اور ڈینی کن جیسے ترقی دشمن اور رجعت پرست لیڈروں کو شکست نہیں دے سکتے تھے۔ اور آذربائیجان اور آرمینیا کی ریاستیں کبھی بھی وجود میں نہیں آسکتی تھیں سوویٹ جمہوریتوں کا مستحکم ہونا اور ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم و تشدد کا خاتمہ ہونا ایک ہی سیاسی عمل کے دو پہلو ہیں۔ یہ سیاسی عمل کیا ہے؟ —— سامراجی غلامی سے محنت کش عوام کا نجات حاصل کرنا۔

سوویٹ جمہوریتوں کے ایسے وفاق کے قیام سے جس کی بنیاد مشترکہ فوجی اور معاشی امور پر قائم ہو۔ مندرجہ ذیل مقاصد حل ہوتے ہیں:۔

(۱) پورے وفاق اور اس میں شامل ہر جمہوریت کی معاشی ترقی ہوتی ہے اور اُن کا اتحاد اور اندرونی استحکام برقرار رہتا ہے۔

(۲) اگرچہ وفاق میں مختلف قوموں کے مختلف سماجی، تہذیبی اور معاشی حالات کا اختلاف ہوتا ہے اور مختلف قومیں مختلف سطحوں پر ہوتی ہیں۔ لیکن پھر بھی ایک قوم پر دوسری قوم کا ظلم و تشدد نہیں ہوتا۔ عام وفاق کے اندر تہذیبی اختلافات کے مطابق جمہوریتوں کو ملا کر مختلف قسم کے وفاق بنائے جا سکتے ہیں۔

(۳) ان تمام قوموں کے درمیان، پُر امن رشتے اور برادرانہ اتحاد و اشتراک قائم رہتا ہے جو مختلف صورتوں میں وفاق سے اپنی قسمت وابستہ کئے ہوتے ہیں۔ روس میں اسی قسم کے مختلف وفاق بنائے گئے ہیں۔ ایک قسم تو وُہ ہے جو سوویٹ خود مختاری پر مبنی ہے۔ اس وفاق میں

ا‌ے جیسا کہ اسٹالن پہلے بتا چکا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوموں کی معاشی نابرابری ختم ہو اور سب قومیں ترقی کی ایک ہی سطح پر آجائیں۔

یہ ریاستیں شامل ہیں کہ غیر جمہوریت، باشکیر جمہوریت، تاتار جمہوریت، گورتسی، داغستان ـــ دوسری قسم کا وفاق وُہ ہے جو مختلف آزاد سوویٹ ریاستوں کے درمیان معاہدوں پر قائم ہے۔ مثلاً یوکرین اور آذربائیجان سے اسی قسم کے تعلقات قائم ہیں۔ ان دونوں کے بیچ میں بھی درمیانی قسمیں ہیں۔ مثلاً ترکستان اور سفید روس۔ غرض یہ کہ روس کے تجربے نے پورے طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ سوویٹ جمہوریتوں کے درمیان جو سیاسی اتحاد ہیں۔ ان کی شکل وفاق کی ہے ؂

اکتوبر انقلاب اور قومی سوال

قومی سوال کوئی ایسا سوال نہیں ہے جو اپنا مقصد آپ ہو اور ہر زمانے میں اس کی شکل ایک ہی ہو۔ قومی سوال دراصل موجودہ نظام کے ٹوٹنے اور نئے نظام کے قائم ہونے کے عام مسئلہ کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ قومیت کا مسئلہ سماجی ماحول سے پورے پورے طور پر متعین ہوتا ہے۔ کسی ملک میں سیاسی اقتدار کی نوعیت کیا ہے؟ اور سماجی ارتقا نے کون سا طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہ باتیں بھی قومی سوال کو متعین کرتی ہیں۔ جب روس میں انقلاب ہو رہا تھا تو اس وقت کے حالات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں انقلاب کی رفتار کے ساتھ ساتھ روس کے سرحدی

علاقوں میں چلتی ہوئی قومی تحریکیں بھی اپنی نوعیت اور اپنا کردار بدلتی جا رہی تھی۔ روس کے سرمایہ دار انقلاب کے زمانے (فروری ۱۹۱۷ء) میں رُوس کے سرحدی علاقوں میں چلتی ہوئی قومی تحریکوں کی نوعیت بھی سرمایہ دار انقلاب کی تھی۔ اس انقلاب میں محکوم قوموں نے جو صدیوں سے پرانے نظام اور پرانی حکومت کے ظلم و تشدد کا شکار تھیں۔ پہلی مرتبہ اپنی طاقت کو اپنے حاکموں کے خلاف لڑائی میں جھونک دیا۔ اس وقت قومی تحریک کا مخصوص نعرہ یہ تھا کہ ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت کو ختم کیا جائے۔ پلک جھپکاتے ہی روس کے تمام سرحدی علاقوں میں قومی ادارے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان قومی تحریکوں کی رہنمائی قوم پرست بورژوا، پڑھے لکھے طبقوں میں تھی۔ لیٹویا، استھونیا، لتھوانیا، جارجیا آرمینیا، آذربائیجان، کاکیشس، کرغزستان اور وسطی والگا کا علاقہ یوکرین، سفید رُوس، بلیسربیا، کریمیا، باشکیریا، ترکستان، غرض ہر جگہ قومی تحریکیں پیدا ہو گئیں۔ انہیں قومی تحریکوں میں ہر ملک کے سرمایہ دار طبقے نے اپنی طاقت لگا دی۔ ان کے سامنے مقصد یہ تھا کہ زار کی حکومت سے چھٹکارا ملے اور قومی سرمایہ دار طرز کی ریاستیں قائم ہوں حق خود ارادیت کا مطلب یہ نکالا گیا کہ ان قوموں سے ہر قوم کا بورژوا طبقہ وہاں کا سیاسی اختیار و اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لے اور مزدوروں کے انقلاب

سے فائدہ اُٹھا کر اپنی اپنی قومی ریاستیں قائم کریں۔ اس کے بعد یا اس قومی تحریک کے سامنے اور کوئی مقصد نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یعنی ان کے سامنے مزدور اور کسان کا راج قائم کرنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ان قومی تحریکوں کے چلانے والے اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے تھے۔ کہ ایک نیا ننگا سامراج زار کی جگہ لے رہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ یہ نیا سامراج ان نئی قوموں کا زیادہ خطرناک اور زیادہ مضبوط دشمن ہے اور وہ ایک نئے ظلم و تشدد کی بنیاد بن سکتا ہے۔

زار کی حکومت کے ختم ہو جانے اور سرمایہ دار طبقے کے برسرِ اقتدار ہونے کے بعد ایک قوم پر دوسری قوم کا ظلم و تشدد ختم نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی جگہ ایک نیا متمدن لیکن پہلے سے زیادہ خطرناک قسم کا ظلم و تشدد شروع ہو گیا۔ کیرنسکی میلیوکوف اور لوو، کی حکومت نے ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم و تشدد کو ختم کرنے کی بجائے فن لینڈ اور یوکرین پر ایک نیا حملہ شروع کر دیا۔ ۱۹۱۷ء کی گرمیوں میں فن لینڈ کی مجلس قانون ساز ختم کر دی گئی۔ یوکرین کے تہذیبی اداروں کے خلاف ایک عام جنگ چھیڑ دی گئی۔ یہی نہیں بلکہ اس سامراجی حکومت نے عوام سے سامراجی جنگ کو جاری رکھنے کا مطالبہ کیا تا کہ وہ نئے ملکوں کو غلام بنا سکیں اور نئی نو آبادیات

اور نئی قوموں کو غلامی کی زنجیریں پہنا سکیں۔ یہ حکومت نہ صرف اس لئے یہ راستہ اختیار کر رہی تھی۔ کہ اس کی فطرت ہی سامراجی تھی۔ بلکہ اس لئے بھی کہ مغربی یورپ پرانی سامراجی ریاستیں نئے ملکوں اور قوموں کو ہتھیانے کی کوشش کر رہی تھیں جس سے روسی حکومت کے سامراجی دائرۂ اثر کے تنگ اور محدود ہو جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ سامراجی جنگ ہمارے سامنے جو نقشہ پیش کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سامراجی ریاستیں چھوٹی قوموں کو غلام بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ جس کے بغیر وہ سامراجی ریاستیں بھی زندہ نہیں رہ سکتی تھیں۔ جب روس میں زار کی حکومت ختم ہوگئی اور ملیوکوف کرنسکی کی حکومت قائم ہوئی۔ تو بھی کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ روس کے سرحدی علاقوں میں جو قومیں آباد تھیں۔ وہ پوری سیاسی آزادی چاہتی تھیں۔ روس کی سامراجی حکومت نے قدرتی طور پر ان کی سخت مخالفت کی۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ چونکہ ان مختلف قومی تحریکوں میں ہر قوم کا سرمایہ دار طبقہ برسرِ اقتدار آگیا۔ اسلئے اسکے اپنے کسانوں اور مزدوروں میں بےچینی پھیل گئی۔ یہ قومی تحریکیں روس کی سامراجی حکومت کے دباؤ کے سامنے بالکل بے بس تھیں۔ کسانوں اور مزدوروں کی طرف سے بھی خطرے پیدا ہو گئے تھے چنانچہ بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار کے سامنے یہ سرمایہ دار قومی ریاستیں پھلنے پھولنے سے پہلے ہی مرجھانے لگیں۔

اس طرح حقِ خود ارادیت کا پُرانا سرمایہ دارانہ مفہوم بے معنی ہو گیا اور اس کی انقلابی اہمیت ختم ہو گئی۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم و تشدّد کے ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا اور نہ چھوٹی چھوٹی قومیں آزاد رہ سکتی تھیں۔ سب پر ظاہر ہو گیا کہ محنت کش عوام اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتے اور ایک قوم پر دوسری قوم کا ظلم و تشدد اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا۔ جب تک سامراجیت سے بالکل ہاتھ نہ دھو لیا جائے اور جب تک ہر قوم میں سرمایہ دار طبقے کا زوال نہ ہو اور جب تک محنت کش عوام اختیارات اپنے ہاتھوں میں نہ لے لیں۔ چنانچہ اکتوبر کے انقلاب کے بعد یہ باتیں ہو کر رہیں۔

فروری میں روس میں جو انقلاب ہوا۔ وہ نتیجہ تھا مزدوروں اور کسانوں اور کسان سپاہیوں کی کوششوں کا۔ لیکن انقلاب کے بعد اختیارات سرمایہ دار طبقے کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ مزدوروں اور کسانوں نے اس لئے انقلاب کیا تھا کہ انہیں جنگ سے نجات مل جائے اور امن نصیب ہو۔ لیکن سرمایہ دار طبقے نے با اختیار ہونے کے بعد جنگ کو جاری رکھنا چاہا اور امن کی مخالفت کی۔ ملک میں معاشی ابتری پھیلی ہوئی تھی اور غذا کی سخت کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ ان باتوں کا

تقاضا یہ تھا۔ کہ مزدوروں کے فائدے کے لئے صنعتوں کو اور سرمایہ دار طبقے کے سرمایہ کو ان کے ہاتھوں سے چھین کر مزدوروں کو دے دیا جائے اور بڑی بڑی زمینداریاں کسانوں میں تقسیم کر دی جائیں لیکن میلیو کوف، کرنسکی کی حکومت سرمایہ داروں اور زمینداروں کے مفاد کی حفاظت کر رہی تھی۔ اس طرح فروری کا انقلاب دراصل سرمایہ دار طبقے کا انقلاب تھا۔ اگرچہ یہ انقلاب مزدوروں اور کسانوں نے پیدا کیا تھا لیکن اس سے فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ سرمایہ دار ملک جنگ کی وجہ سے ہولناک معاشی بدحالی اور غذا کی کمی کا سامنا کر رہا تھا۔ محاذِ جنگ ٹوٹ رہا تھا۔ رُوسی فوجیں پیچھے ہٹ رہی تھیں۔ کارخانے اور ملیں بند ہو گئی تھیں۔ قحط کا ملک میں دور دورہ تھا۔ فروری کا انقلاب ملک کو ان مصائب سے نہیں بچا سکتا تھا چنانچہ ملک کو سامراجی جنگ اور معاشی تباہی کے دلدل سے نکالنے کیلئے ایک نئے اشتراکی انقلاب کی ضرورت تھی۔ اکتوبر میں جب مزدوروں اور کسانوں نے سیاسی مشینری پر اپنا قبضہ جما لیا تو وہی اشتراکی انقلاب رونما ہوا۔ اس انقلاب میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ زمینداروں اور بڑے کسانوں کی طاقت ختم ہو گئی اور زمین کا استعمال محنت کش کسان عوام کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ کارخانے اور ملیں ضبط کر کے مزدوروں کو دے دی

گئیں۔ سامراجی حکومت ختم کر دی گئی اور سامراجی جنگ بھی بند کر دی گئی روس کی گذشتہ سامراجی حکومت نے دنیا کی دوسری سامراجی طاقتوں سے چھوٹی قوموں اور کمزور ملکوں کو ہتھیانے کے لئے جو معاہدے کئے تھے۔ وہ شائع کر دیئے گئے اور ساری دنیا پر سامراجیوں کی سازش کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ ستائی ہوئی قوموں کے محنت کش عوام کی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا گیا اور فن لینڈ کی آزادی تسلیم کر لی گئی۔ یہ تھیں وہ اہم کارروائیاں جو انقلاب کے دوران میں سوویت حکومت نے کیں۔ یہ صحیح معنوں میں اشتراکی انقلاب تھا۔ یہ انقلاب مرکز سے شروع ہوا تھا لیکن وہ زیادہ عرصے تک اس تنگ علاقے میں محدود نہیں رہ سکا اور سرحدی علاقوں تک تیزی سے پھیل گیا۔ لیکن سرحدی علاقوں میں پہنچ کر اس انقلابی سیلاب کو آہنی دیواروں سے ٹکر لینی پڑی۔ یہ آہنی دیواریں کیا تھیں؟ قومی اور علاقائی حکومتیں مثلاً ڈان، کیوبن، سائبیریا، یہ حکومتیں اکتوبر سے پہلے ہی وجود میں آگئی تھیں اور چونکہ یہ سرمایہ دار حکومتیں تھیں۔ اس لئے اشتراکی انقلاب کی مخالفت کر رہی تھیں اس حکومت پر سرمایہ دار طبقے کا قبضہ تھا جو پرانے سرمایہ دارانہ نظام کو برباد کرنے کی بجائے اس کی حفاظت کر رہا تھا۔ وہ لازمی طور پر سامراجی حکومتیں تھیں۔ چنانچہ وہ اس بات کی تاک میں تھیں کہ جب بھی

موقع ملے۔ غیر قوموں کے حصے بخرے کئے جائیں۔ لازمی طور پر سرحدی علاقوں کی ان قومی حکومتوں نے مرکز کی اشتراکی حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور خود انقلاب دشمنی کا اکھاڑا اور اڈا بن گئیں۔ تمام وہ لوگ جو انقلاب کی مخالفت کر رہے تھے۔ ان علاقوں کی طرف کھنچ آئے۔ ان علاقوں میں اشتراکی حکومت کے خلاف جنگ کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ انقلاب کے مخالف لوگ روس سے بھاگ کر ان علاقوں میں پہنچے اور وہیں "سفید محافظوں کے قومی دستے" بنائے گئے۔

لیکن ان سرحدی علاقوں میں قومی حکومتوں کے علاوہ کسان اور مزدور بھی موجود تھے۔ اکتوبر کے انقلاب سے پہلے ہی ان مزدوروں اور کسانوں نے اپنی "نمائندوں کی انقلابی سوویٹیں" بنالی تھیں۔ جو ان سوویٹوں کے نمونے پر تھیں جو مرکزی روس میں موجود تھیں۔ سرحدی علاقوں کی ان سوویٹوں نے اپنے شمال کے ساتھیوں سے تعلقات منقطع نہیں کئے تھے اور وہ بھی سرمایہ دار طبقے کو شکست دینا چاہتی تھیں۔ اس طرح ان سرحدی علاقوں کی سوویٹوں کا خود اپنے وہاں کی قومی حکومتوں سے روز بروز تصادم بڑھ رہا تھا۔ اکتوبر کے انقلاب نے روس کے مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ سرحدی علاقوں کے مزدوروں اور کسانوں کے تعلقات مضبوط کر دیئے۔ انہیں اشتراکیت کی فتح کا یقین دلایا اور

ان کو عمل پر ابھارا۔ چنانچہ جب سرحدی علاقوں کی سرمایہ دار قومی حکومتوں نے مرکزی سوویت حکومت کے خلاف جنگ چھیڑی تو ان علاقوں کی سوویٹوں کے ذریعے مزدوروں اور کسانوں نے اپنے اپنے علاقے کے سرمایہ داروں کے خلاف جدوجہد کی۔ اس طرح ان سرمایہ دار حکومتوں کے خلاف پورے روس کے کسانوں اور مزدوروں کا اشتراکی اتحاد قائم ہوا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سرحدی علاقوں کی قومی حکومتوں نے یہ جنگ سوویت حکومت کی مرکزیّت کے خلاف شروع کی تھی لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ دنیا کی کسی بھی حکومت نے اپنی قوموں کو اتنی وسیع غیر مرکزیت اور اتنی مکمل قومی آزادی عطا نہیں کی ہے۔ جتنی روس کی سوویت حکومت نے۔ اس جنگ کی اصل نوعیت یہ تھی کہ انقلاب کے جن سرمایہ دار دشمنوں نے اشتراکیت کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ وہ قومی جھنڈے کے ذریعے اپنے اپنے عوام کو دھوکا دے رہے تھے اور وہ جھنڈا سرمایہ داروں کے انقلاب دشمن ارادوں کی پردہ داری کر رہا تھا۔

سوویٹ طاقت کے خلاف اس جنگ میں سرمایہ دار قومی اور علاقائی حکومتوں کا شکست کھانا ایک لازمی امر تھا۔ ان پر دو سمتوں سے حملہ ہوا۔ باہر سے سوویت حکومت نے حملہ کیا اور اندر سے خود ان کے مزدوروں اور کسانوں نے۔ چنانچہ پہلی ہی مڈبھیڑ میں یہ قومی حکومتیں دُم

دبا کر پیچھے ہٹ گئیں۔ فن لینڈ کے صنعتی اور زرعی مزدوروں نے بغاوت کی اور وہاں کے سرمایہ داروں کی مجلس قانون ساز کو راہِ فرار اختیار کرنا پڑا۔ یوکرین کے مزدوروں اور کسانوں نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ اور سرمایہ داروں کی مجلسِ قانون ساز بھاگ کھڑی ہوئی۔ ڈان، کیوبن، اور سائبیریا کے مزدوروں اور کسانوں نے بھی بغاوت کی اور کیلیے ڈین کارنیلوف، سائبیریا کی حکومتوں کو شکست فاش نصیب ہوئی۔ ترکستان کے غریب کسانوں نے بغاوت کی اور وہاں کی خودمختار حکومت دُم دبا کر بھاگ گئی۔ کاکیشس میں زرعی انقلاب رونما ہوا اور جارجیا، آرمینیا اور آذربائیجان کی قومی مجلسوں نے اپنی مکمل بیچارگی ظاہر کر دی۔ یہ تمام واقعات اب معلوماتِ عامہ کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ سرحدی علاقوں کی سرمایہ دار حکومتوں کا خود وہاں کے عوام سے تمام رشتہ منقطع ہو چکا تھا جب ان "قومی حکومتوں" نے شکست کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ دیکھا تو انہوں نے نہایت بے شرمی کے ساتھ خود اپنے مزدوروں اور کسانوں کے خلاف مغربی یورپ کی سامراجی حکومتوں سے امداد چاہی۔ یہ مغربی سامراجی وہی تھے۔ جو دنیا کی چھوٹی چھوٹی قوموں کو مدتوں سے لوٹ کھسوٹ رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً ان نام نہاد قومی حکومتوں کی امداد کے لئے اپنی اپنی فوجیں بھیجیں

اس طرح روس کی اشتراکی حکومت کے خلاف غیر ملکی مداخلت کا دور شروع ہوا اور سرحدی علاقوں پر غیر ملکی فوجیں آ دھمکیں۔ اس نئے دور میں یہ بات اور ثابت ہو گئی کہ یہ علاقائی اور "قومی حکومتیں" انقلاب کی دشمن ہیں۔ یہ بات سب پر ظاہر ہو گئی کہ قومی سرمایہ دار طبقہ "اپنی قوم" کی آزادی اور خود مختاری کی جدوجہد نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ محض اس بات کی آزادی چاہتا ہے کہ اپنی قوم کے عوام سے منافع اینٹھے۔ اپنے ناجائز مراعات حاصل کرے اور اپنے سرمایہ کو محفوظ رکھے۔

اب یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ جب تک سامراجی پالیسی سے قطع تعلق نہ کیا جائے۔ جب تک سرمایہ داری کا زوال نہ ہو اور جب تک محنت کش عوام کے ہاتھوں میں سیاسی طاقت نہ آ جائے۔ اس وقت تک مظلوم اور ستائی ہوئی قوموں کی آزادی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا قومی سرمایہ دار طبقے نے حق خود ارادیت کا جو تصور پیش کیا تھا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ تمام تر سیاسی اقتدار قومی سرمایہ دار طبقے کے ہاتھوں میں ہو۔ لیکن انقلاب کے طوفانی دوران میں اس تصور کی جڑیں کھوکھلی ہو گئیں اور اس کی بجائے حق خود ارادیت کا اشتراکی تصور پھیل گیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام تر سیاسی اقتدار ستائی ہوئی قوموں کے محنت کش عوام کے ہاتھ میں ہو۔ اکتوبر کے انقلاب نے قومی آزادی کی پرانی سرمایہ دارانہ تحریک کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔

اس تحریک کے کھنڈرات سے نسائی ہوئی قوموں کے کسانوں اور مزدوروں کی اشتراکی تحریک طلوع ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہر قسم کا ظلم و تشدد ختم ہو جائے۔ اس ہر قسم کے ظلم و تشدد کے خاتمے کے سلسلے میں لازمی طور پر ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم و تشدد کے خاتمے کا پروگرام بھی شامل تھا محنت کش عوام کی اشتراکی تحریک نہ صرف غیر ملکی سرمایہ داروں کے خلاف تھی بلکہ خود اپنے ملک کے سرمایہ دار طبقے کے خلاف بھی۔ اس طرح یہ تحریک عام طور پر پورے سامراج کے خلاف تھی۔

اکتوبر کا انقلاب اور کمیونسٹوں کی قومی پالیسی

اکتوبر کے انقلاب کی طاقت اس حقیقت میں مضمر تھی کہ یورپ کے مغربی ملکوں کے انقلابات کے برخلاف روسی انقلاب میں روسی مزدوروں کے گرد لاکھوں چھوٹے سرمایہ دار طبقے کے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے اور اس چھوٹے سرمایہ دار طبقے کے سب سے طاقتور اور سب سے کثیر التعداد نچلے حصے یعنی کسانوں نے روس کے مزدور انقلابیوں کا ساتھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روس کا سرمایہ دار طبقہ اکیلا رہ گیا۔ اس کے پاس فوج نہ رہی۔ دوسری طرف روس کا مزدور طبقہ ملک کی قسمت کا مالک اور رہنما بن گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو روس کے مزدوروں کے لئے اپنی طاقت اور اقتدار کو برقرار رکھنا غیر ممکن ہو جاتا۔

امن، زرعی انقلاب اور قوموں کی آزادی - یہ تھے تین خاص عناصر جنہوں نے روس کے وسیع و عریض ملک کی بلیں قوموں کے کسانوں اور مزدوروں کو روسی مزدوروں کے سُرخ جھنڈے کے گرد جمع کر دیا۔

قومی آزادی کے بارے میں یہاں پر کچھ کہنا ضروری ہے۔ یعنی یہ کہ سوویت نظام کے اندر بسنے والی مختلف قوتوں کو کس قسم کی آزادی حاصل ہے۔

سوویٹ ریاستوں کی پوری آبادی چودہ کروڑ ہے (اس میں فن لینڈ استھونیا، لیٹویا، لتھوانیا اور پولینڈ کو شامل نہیں کیا گیا) ان چودہ کروڑ میں چھ کروڑ پچاس لاکھ لوگ ان قوموں کے ہیں جنہیں غیر روسی قوم کہا جاتا ہے۔ یہ قومیں زیادہ تر سرحدی علاقوں میں آباد ہیں اور فوجی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو آسانی سے بیرونی حملوں کا شکار ہو سکتی ہیں۔ پھر ان سرحدی علاقوں میں کچّا مال، ایندھن اور غذا کی اشیا بھی کافی مقدار میں موجود ہیں۔ یہ سرحدی علاقے مرکزی روس کے مقابلے میں صنعتی اور فوجی اعتبار سے یا تو کم ترقی یافتہ ہیں یا بالکل ہی پچھڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے مرکزی روس کی معاشی اور فوجی امداد کے بغیر وہ اپنی آزادی برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اسی طرح مرکزی روس سرحدی علاقوں کے ایندھن، کچّے مال اور غذائی اشیا کے بغیر اپنی معاشی اور فوجی طاقت برقرار نہیں رکھ سکتا۔

روس کے کمیونسٹوں نے سرحدی علاقوں کی قوموں کے ساتھ جو پالیسی اختیار کی ہے۔ اس میں ان حالات کا بڑا دخل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کمیونسٹوں کے قومی پروگرام کی کچھ اہم باتیں بھی شامل ہیں۔ اس پالیسی کی متعلق اہم باتیں یہ ہیں۔ غیر رُوسی قوموں کے علاقوں پر تمام دعووں اور حقوق سے دست بردار ہو جانا اور ان قوموں کے حق کو تسلیم کر لینا' نہ صرف الفاظ سے بلکہ عمل سے۔ قومی ریاستوں کی آزادی اور خود مختاری کو برقرار رکھنا۔ ان قوموں کا خود اپنی خواہش اور فیصلے سے مرکزی روس کے ساتھ فوجی اور معاشی اتحاد قائم کرنا۔ تہذیبی اور معاشی ترقی میں پست حال قوموں کی امداد کرنا۔ اس امداد کے بغیر "قومی برابری" محض الفاظ کا گورکھ دھندا ہو کر رہ جائے گی۔ ان تمام چیزوں کی بنیاد دو باتوں پر ہے۔ ایک تو یہ کہ سوویت وفاق میں شامل قوموں کے کسانوں کو آزادی حاصل ہے۔ اور دوسرے وہاں کے محنت کش طبقے کے ہاتھوں میں تمام تر سیاسی اقتدار سونپ دیا گیا ہے۔ یہ ہے روس کمیونسٹوں کی پالیسی سوویٹ وفاق کی قوموں کے ساتھ۔ اگر رُوس کے کمیونسٹ عملاً اس قومی پالیسی کو چلانے کے لئے اپنی رضامندی نہ ظاہر کرتے۔ اگر وہ فن لینڈ پر اپنے حقوق جتانا نہ چھوڑ دیتے۔ اگر وہ شمالی ایران سے اپنی فوجیں نہ ہٹا لیتے۔ اگر وہ منگولیا اور چین کے کچھ علاقوں پر انقلاب سے پہلے کے روسی سامراجی دعووں سے دست بردار

نہ ہو جاتے۔ اگر وہ پچھڑی ہوئی قوموں کو لسانی آزادی نہ دیتے تو روس کے مزدور برسرِ اقتدار آنے کے بعد دوسری قوموں کے مزدوروں اور غیر خود مختار قوموں کے ستائے ہوئے عوام کا اعتماد اور ہمدردی ہرگز حاصل نہ کر سکتے تھے۔ اسی اعتماد نے سوویٹ وفاق کی قوموں میں ناقابلِ شکست اتحاد پیدا کیا۔ اس اتحاد کے سامنے غیر ملکوں کی تمام سیاسی چالیں اور ان کی ناکہ بندیاں بیکار اور ناکام ثابت ہوئیں۔ اگر روس کے مزدوروں کو سرحدی علاقوں کے ستائے ہوئے عوام کی ہمدردی اور اعتماد نہ حاصل ہوتا تو وہ کبھی بھی کولچاک، ڈینی کن، اور رانیگل کو شکست نہیں دے سکتے۔ ان غدّار فوجی سرداروں کا میدانِ عمل وہ سرحدی علاقے تھے۔ جہاں زیادہ تر غیر روسی قومیں آباد تھیں۔ جو کولچاک، ڈینی کن، اور رنیگل سے نفرت کرنے پر مجبور تھیں۔ اس لئے کہ ان فوجی سرداروں کی پالیسی سامراجی تھی اور وہ غیر روسی قوموں کی تہذیب و تمدّن کو مٹا کر ان کو روسی سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے مغربی سامراجیوں کے اتحاد ثلاثہ نے جب روسی سیاست میں مداخلت شروع کی اور ان غدّار فوجی سرداروں کی حمایت کی تو اس اتحادِ ثلاثہ کو سرحدی علاقوں کے ان عناصر کا سہارا لینا پڑا۔ جو غیر روسی قوموں کو روسی سانچے میں ڈھالنے کے حمایتی تھے۔ اس بات نے سرحدی علاقوں کے عوام کے دل میں ان غدّار فوجی افسروں کے خلاف دیرینہ نفرت کو اور بھی تیز کر دیا

اور وہاں کے عوام سوویٹ حکومت کے اور بھی ہمدرد بن گئے۔ کولچک، ڈینی کن اور رانگل کی اندرونی بنیاد کو اس طرح کمزور کر دیا گیا اور آگے چل کر انہیں شکست فاش نصیب ہوئی۔ روس کے کمیونسٹوں کی اس پالیسی کے اچھے نتائج سوویت وفاق میں شامل قوموں ہی تک محدود نہیں رہے۔ بلکہ اس کا نتیجہ یہ بھی ظاہر ہوا کہ روس کے ساتھ ہمسایہ ملکوں کا طرزِ عمل بھی بدل گیا۔ ترکی، ایران، افغانستان اور روس کی مشرقی سرحد کے دوسرے ملکوں نے روس کے ساتھ اپنا رویّہ یکسر بدل دیا۔ پہلے رُوس ان ملکوں کے لئے ایک ہوّا بنا ہوا تھا۔ لارڈ کرزن جیسے سیاستدان نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔

آر۔ ایس۔ ایف۔ ایس۔ آر اور اس سے ملحق سوویت ریاستوں میں کوئی چودہ کروڑ کی آبادی ہے۔ ان میں سے غیر روسی قوموں کی آبادی چھ کروڑ پچاس لاکھ ہے۔ یہ غیر روسی قومیں یہ ہیں۔ یوکرینی، سفید روسی کرغیز، اُزبک، ترکمان، تاجک، آذربائیجانی، والگا کے تاتار، کریمیا کے تاتار، اہلِ بخارا، اہلِ خیوا، باشکیری، آرمینی، چیچینی، کبرو بائی، اوسٹ، سرکیشی، کراچائی، بال کیری، کالمک، اہلِ کیبریلیا، ادیری دارغی، کازی کوموفی، کیورن، کومک، میرس، چووشی، ووٹ، والگا کے جرمن، اہلِ بریت، یاکوتی، وغیرہ وغیرہ۔

زارادر زمیندار اور سرمایہ دار کی پالیسی ان قوموں کے ساتھ یہ تھی ۔ کہ ان کے اندر ریاست کو بالکل نہ پنپنے دو اور ریاست کے جو کچھ جراثیم ہیں ۔ ان کو بھی ختم کردو ۔ ان کی تہذیب مٹا دو ۔ ان کی مادری زبان پر پابندیاں عائد کرو ۔ ان کی جہالت قائم رکھو اور جہاں تک ممکن ہو سکے ۔ ان کی قومیّت کو مٹا کر انہیں رُوسی سانچے میں ڈھال دو ۔ اس پالیسی کے تحت لازمی طور پر یہ قومیں بہت پیچھے رہ گئیں اور اُن کے اندر سیاسی ترقی نہ ہو سکی ۔ اب جبکہ مزدوروں اور زمینداروں کا اقتدار ختم ہو گیا ہے اور ان ملکوں میں بھی سوویٹ حکومتیں قائم ہو گئی ہیں تو روس کی کمیونسٹ پارٹی کے سامنے یہ پروگرام ہے کہ غیر روسی قوموں کے محنت کش عوام کی مدد کی جائے ۔ تاکہ وہ مرکزی رُوس کی ترقی کی سطح پر آجائیں ۔ کمیونسٹ پارٹی مندرجہ ذیل باتوں میں ان قوموں کی مدد کر رہی ہے ۔

ہر قوم اپنے مخصوص قومی کردار کے مطابق اپنی سوویت ریاست کو ترقی دے ۔ ہر قوم خود اپنی عدالت خود اپنے تنظیمی شعبے اور خود اپنے معاشی اور سرکاری شعبے قائم کرے ۔ تمام امور مادری زبان میں انجام دیئے جائیں ۔ ہر قوم کے عہدے دار خود اسی قوم کے لوگوں سے چُنے جائیں ۔ اس لئے کہ وہ اپنی قوم رسوم و رواج کی نفسیات سے واقف ہونگے ۔ ہر قوم اپنے پریس ۔ اپنے اسکول ، اپنے تھیٹر ، اپنے کلب اور اپنے تہذیبی اور تعلیمی

ادارے قائم کرے اور یہ تمام ادارے اپنا کاروبار مقامی زبان میں چلائیں سوویت وفاق کی غیر روسی آبادی ساڑھے چھ کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ اگر اس میں سے وہ علاقے نکال دئے جائیں جو کم و بیش سرمایہ داری کے دور سے گزر چکے ہیں (یوکرین، سفید روس، آذربائیجان کا چھوٹا سا حصہ اور آرمینیا) تو کوئی تین کروڑ آبادی رہ جاتی ہے۔ یہ آبادی زیادہ تر ترکی قوموں پر مشتمل ہے۔ یعنی ترکستان، آذربائیجان کا بیشتر حصہ، داغستان، گورشی قوم، تاتار، باشکیری، کرغیزی، اور دیگر قومیں —— یہ قومیں سرمایہ دارانہ دور سے نہیں گزری تھیں۔ ان کے اندر صنعتی مزدوروں کا طبقہ موجود ہی نہیں تھا یا اگر تھا بھی تو اتنی کم تعداد میں کہ نہ ہونے کے برابر۔ یہ قومیں ابھی تک چرا گاہی اور سر قبیلی طرز کی زندگی گذار رہی تھیں۔ جیسے کرغیزیا۔ باشکیریا اور شمالی کاکیشس یا ان میں سے ایسی قومیں بھی تھیں جو ایک قدیم طرز کی نیم سر قبیلائی اور نیم جاگیر دارانہ طرز کی زندگی سے آگے نہیں بڑھ سکی تھیں۔ مثلاً آذربائیجان اور کریمیا وغیرہ۔ لیکن یہ تمام قومیں سوویت نظام کی ترقی کے مشترکہ دھارے میں کھنچ آئیں۔ ان قوموں کے ساتھ کمیونسٹوں کے منجملہ اور فرائض میں ایک فرض یہ بھی ہے کہ ان کے سر قبیلائی اور جاگیر دارانہ نظام کے اثرات ختم کرنے میں ان قوموں کی مدد کرنا۔ محنت کش کسانوں کی پنچائتوں یعنی سوویتوں کی بنیاد پر ایک سوویت طرز کے معاشی نظام

تعمیر کرنے میں مدد کرنا اس مقصد کے لئے ان قوموں میں مضبوط کمیونسٹ اداریے قائم کرنا ایسے ادارے جو سوویت اور معاشی ترقی کے کام میں روسی مزدوروں اور کسانوں کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اور ہر قوم کے علیحدہ علیحدہ معاشی حالات، طبقاتی نظام، تہذیب، عادات اور رسوم کے ساتھ، اپنے تعمیری کام کو ہم آہنگ اور با ربط بنا سکیں۔ اس سلسلے میں مرکزی روس میں جو معاشی کاروائیاں کی گئیں۔ ان کو جوں کا توں ان پچھڑی ہوئی قوموں پر مسلط کر دینا غلط ہوتا۔ اس لئے کہ یہ قومیں مرکزی روس کے مقابلے میں معاشی ترقی کی اس سطح پر ابھی نہیں پہنچ سکی تھیں۔

اگر ان تین کروڑ باشندوں سے جن میں زیادہ تر ترکی نسل کی قومیں ہیں۔ مندرجہ ذیل قوموں کو علیحدہ کر دیں تو ایک کروڑ باشندے رہ جاتے ہیں۔ آذربائیجان، ترکستان کا بیشتر حصہ، والگا کی جمہوریت، کریمیا کی تاتار جمہوریت، بخارا، خیوا، داغستان، کوہستان کا ایک حصہ جس میں کباروی سرکیشی اور باشکیری قومیں شامل ہیں اور کچھ اور دیگر قومیں جو پہلے ہی سے خاص خاص علاقوں میں بس گئی تھیں اور ان سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ ان قوموں کو علیحدہ کر دینے کے بعد ایک کرور باشندے رہ جاتے ہیں جو مندرجہ ذیل قوموں میں منقسم ہیں۔ کرغیزی، باشکیری، چیچینی، اوسیٹی

اور انگوشی۔ انقلاب سے پہلے ان قوموں کی زمینوں کو روسی قوم کے لوگوں نے اپنی نو آبادیات بنالیا تھا۔ روسیوں نے ان کی سب سے قابلِ کاشت زمین چھین لی تھی اور نہایت منظم طریقے سے ان قوموں کو تبدریج خشک اور بنجر ریگستان میں دھکیل رہے تھے۔ حکومتِ زار، زمینداروں اور سرمایہ داروں کی یہ پالیسی تھی کہ ان علاقوں میں روسیوں، کوسانکوں، اور روس کے دولت مند کسانوں کی بیش از بیش تعداد بسا دی جائے تاکہ روس کو بڑی طاقت بننے میں ان سے مدد مل سکے

ان ستائی ہوئی قوموں کے محنت کش عوام کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کا فرض متذکرہ بالا فرائض کے، علاوہ یہ بھی تھا کہ مقامی روسی آبادی محنت کش عوام اور ان قوموں کے محنت کش عوام کی متحدہ کوششوں سے عام دولت مند کسانوں اور خاص طور پر روسی دولتمند کسانوں کے خلاف جدوجہد کرے جو مدتوں سے اُن کو ستا رہے تھے۔ وہاں کے محنت کش عوام کو قابلِ کاشت زمین دی گئی تاکہ وہ اپنی گزر اوقات کر سکیں اور اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کر سکیں۔

اوپر کی سطروں میں ان منظم اور غیر منظم قوموں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جن کے اندر ایک طبقاتی نظام موجود تھا۔ ان میں سے ہر ایک قوم کسی مخصوص علاقے میں آباد ہے لیکن ان قوموں کے علاوہ آر، ایس، ایف

ایس۔ آر کے اندر قومی جماعتیں اور قومی اقلیتیں دوسری قوموں کی اکثریتوں
کے درمیان پھیلی ہوئی ہیں۔ ان قومی جماعتوں میں کوئی خاص طبقاتی نظام موجود
نہیں ہے اور نہ وہ کسی مخصوص علاقے میں آباد ہیں۔ لیٹوی، استھونی، پولی،
یہودی اور دیگر اقلیتیں اسی طور پر روس میں پھیلی ہوئی ہیں۔ زار کی حکومت
کی پالیسی یہ تھی کہ ان اقلیتوں کو ہر ممکن طریقہ سے نیست ونابود کر دیا جائے
یہاں تک کہ اگر قتلِ عام کی ضرورت پیش آئے تو اس سے بھی دریغ نہ کیا
جائے۔ چنانچہ زار کی حکومت کے دوران میں اسی طرح منظم طریقے سے یہودیوں کے
قتلِ عام کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن انقلاب کے بعد قومی مراعات کو
ختم کر دیا گیا اور تمام قوموں میں مساوات قائم کر دی گئی۔ خود سودیت نظام
کے اندر اقلیتوں کی آزاد ترقی کی گارنٹی موجود ہے۔ چنانچہ ان قومی جماعتوں
کے محنت کش عوام کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کا فریضہ یہ رہا ہے۔ کہ ان
قوموں کو آزادانہ طور پر ترقی کرنے میں مدد دے ؂

اکتوبر کے انقلاب کی بین الاقوامی اہمیت

اکتوبر کے انقلاب کی ایک عظیم الشان بین الاقوامی اہمیت ہے جو مندرجہ ذیل باتوں میں مضمر ہے۔ اس انقلاب نے قومی مسئلے کی غایت اور اس کے مقصد کو وسیع کر دیا ہے۔ اس سے پہلے قومی مسئلہ محض ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم اور تشدد کو ختم کرنے کا مسئلہ تھا۔ لیکن اب قومی مسئلہ نوآبادیات اور ستائی ہوئی قوموں کو سامراج کے پنجے سے چھڑانے کا ایک عام مسئلہ بن گیا ہے۔

(۲) اس انقلاب نے سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے امکانات کو بیحد وسیع کر دیا ہے اور اس کا صحیح طریقہ بھی بتا دیا ہے۔ اس انقلاب نے

مشرق اور مغرب کی ستائی ہوئی قوموں کو سامراج کے خلاف مشترکہ جد وجہد کے لئے متحد کر دیا ہے اور آزادی کے مقصد کو زبردست مدد پہنچائی ہے

(۳) اس انقلاب نے عالمگیر سامراج کے خلاف انقلابات کا ایک نیا محاذ تعمیر کر دیا ہے جو مغربی یورپ کے مزدوروں، روس کے اشتراکیوں اور مشرق کی مظلوم اور محکوم قوموں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح انقلاب نے محکوم مشرق اور اشتراکی مغرب کے درمیان گہرا ربط و اتحاد پیدا کر دیا ہے اور ان کے درمیان جو خلیج حائل تھی۔ ان کو پاٹ دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مشرق اور مغرب کے محنت کش عوام روس کے مزدوروں کے لئے ناقابل بیان جوش و خروش کا اظہار کر رہے ہیں۔ اسی جوش و خروش سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے سامراجی ڈاکوؤں نے کیوں اتنے وحشیانہ غم و غصے کے ساتھ سوویت روس کے خلاف اپنی پوری طاقت لگا دی تھی؟

سوویت وفاق کے چار بُنیادی اُصول

سوویت وفاق کی دُوسری قوموں کے ساتھ روسی حکومت کا کیا روّیہ ہے۔ اس کو مختصراً یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ہر قوم کو علیحدگی کا حق حاصل ہے۔

(۲) جو قومیں ریاست سے علیحدگی اختیار نہ کریں۔ انہیں خطّہ وار خود مختاری عطا کی جائے۔

(۳) ایسے قوانین بنائے جائیں جن سے قومی اقلیتوں کی آزاد ترقی عمل میں آئے۔

(۴) ریاست کی تمام قوموں کے مزدوروں کے لئے ایک واحد مزدور جماعت وجود میں لائی جائے۔

سوویت وفاق میں قوموں کی آزاد شمولیت

سوویت وفاق کی اساس اس بات پر قائم ہے کہ ریاستیں خود اپنی خواہش اور رضامندی سے اس میں شامل ہوتی ہیں۔ وفاق میں جو ریاستیں شامل ہیں۔ ان سب کی قانونی حیثیت برابر ہے۔ ان کی قانونی حیثیت اس لئے برابر ہے کہ ہمارے پروگرام کی بنیاد قوموں کے آزاد سیاسی وجود کے حق پر قائم ہے۔ جب تک قومیں خود اپنی رضامندی سے شامل نہ ہوں۔ اس وقت کوئی بھی وفاق یا کوئی بھی واحد ریاست دائمی اور پائدار نہیں ہو سکتی۔ یہ کہا جا چکا ہے کہ سوویت وفاق میں جتنی قومیں شامل ہیں۔ ان سب کی قانونی حیثیت برابر ہے۔ ممکن ان کے درمیان حقیقی برابری نہ ہو۔ اس لئے کہ ایسی قومیں جو

انقلاب سے پہلے ہی معاشی، سیاسی اور تہذیبی لحاظ سے آگے نکل چکی تھیں اور ایسی قومیں جو پچھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان اب انقلاب کے بعد حقیقی برابری قائم کرنے کا مسئلہ ایک مشکل مسئلہ ہے۔ جس کے حل کرنے میں کئی سال درکار ہیں۔ لیکن بہرحال ان قوموں کو قانونی برابری یقیناً حاصل ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام جمہوریتیں جن سے وفاق کی تشکیل ہوتی ہے۔ یعنی ٹرانس، کاکیشیا، سفید روس، یوکرین اور آر، ایس۔ ایف ایس آر ان چاروں جمہوریتوں کو وفاق سے یکساں فوائد حاصل ہیں اور ان سبھوں نے مساوی طور پر اپنے کچھ آزاد حقوق وفاق کے حوالے کر دیئے ہیں۔ ان چاروں جمہوریتوں میں کسی کو بھی اُمورِ خارجہ کا شعبہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ان کے اُمورِ خارجہ کے شعبے ختم کر دیئے گئے ہیں اور ان کی جگہ پر وفاق کا ایک متحدہ[1] شعبۂ امورِ خارجہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان جمہوریتوں کی آزادی پر کچھ پابندی آگئی ہے۔ جو تمام جمہوریتوں پر یکساں حاوی ہوتا ہے

---

[1] جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اسٹالن نے یہ کتاب کئی سال پہلے لکھی تھی۔ اس دوران میں سوویت وفاق کے دستورِ حکومت میں کافی تبدیلیاں ہو چکی ہیں ۱۹۴۴ء سے اب وفاق میں شامل جمہوریتوں کو شعبۂ امورِ خارجہ رکھنے کی اجازت ہے۔

ان جمہوریتوں میں سے ہر ایک کے پاس پہلے اپنا شعبۂ تجارت خارجہ تھا لیکن اب یہ الگ الگ تجارت خارجہ کے شعبے بند کر دیئے گئے ہیں اور پورے وفاق کا ایک متحدہ شعبۂ تجارت قائم ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ خالص مکتبی اور رسمی انداز میں پوچھتے ہیں کہ کیا جمہوریتوں کے اس طرح منسلک ہو جانے کے بعد ان کی آزادی برقرار رہی؟ یہ ایک خالص مکتبی سوال ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ریاستوں کی خود مختاری پر ایک پابندی ضرور لگ گئی ہے۔ اس لئے کہ مختلف ریاستوں کے اس طرح آپس میں مل کر وفاق قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان ریاستوں کے حقوق پر کچھ پابندی ضرور آگئی ہے۔ لیکن ان ریاستوں کی آزادی کے عناصر برقرار ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہر ریاست کو یہ آزادی ہے کہ وہ جب چاہے۔ اپنی خواہش کے مطابق وفاق سے علیحدہ ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ مکمل آزادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا

وفاق اسی وقت پائدار رہ سکتا ہے اور اُس کے نتائج اُسی وقت کارگر ثابت ہو سکتے ہیں کہ اس کی بنیاد باہمی اعتماد پر قائم ہو اور اس میں تمام قومیں خود اپنی خواہش سے داخل ہوئی ہیں۔ آر، ایس، ایف، ایس، آر دنیا میں واحد ملک ہے۔ جہاں متعدد قوموں کے درمیان پر امن طریقے سے ساتھ رہنے اور برادرانہ اشتراکِ عمل اور تعاون کا تجربہ کامیاب ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وفاق میں حکمران قوم اور غلام قوم کا وجود نہیں۔ نہ تو

یہاں نو آبادیات ہیں اور نہ نو آبادیات کا استحصال کرنے والا غیر ملکی سامراج وفاق کی یہ خصوصیت کہ اس میں تمام قومیں خود اپنی خواہش سے شامل ہوئی ہیں پورے پورے طور پر مستقبل میں برقرار رکھی جائے گی۔ اس لئے کہ صرف اسی قسم کے وفاق کے ذریعے تمام ملکوں کے محنت کش عوام کا وہ اعلےٰ ترین اتحاد رفتہ رفتہ قائم ہو سکتا ہے جس کی ضرورت روز بروز اہم ہوتی جا رہی ہے۔

یہ کہنے کی غالباً ضرورت نہیں ہے کہ اگر روس کے مزدور سیاسی اختیارات حاصل کرنے کے بعد قوموں کی سیاسی علیحدگی کا اعلان نہ کرتے اور اس حقِ علیحدگی کو عمل میں لانے کی آمادگی ظاہر نہ کرتے تو مشرق اور مغرب کی دیگر قوموں کے مزدور کبھی بھی ان کے ہمدرد نہیں بن سکتے تھے۔ مثلاً روس کی مزدور حکومت نے اختیارات حاصل کرنے کے بعد سنہ ۱۹۱۷ء میں فن لینڈ پر سے اپنے حقوق واپس لے لئے۔ شمالی ایران سے اپنی فوجیں ہٹا لیں۔ چین اور منگولیا پر سے اپنے تمام حقوق سے دست بردار ہو گئے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں ؎

سوویت رُوس میں علاقائی خود مختاری

سوال یہ ہے کہ ان قوموں کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ جو چند اسباب کی بنا پر سوویت ریاست کے عام ڈھانچے کے اندر رہنا چاہتی ہیں۔ واحد حل یہ ہے کہ علاقائی بنیاد پر قوموں کو خود مختاری دے دی جائے۔ پولینڈ، لتھوانیا، یوکرین، کاکیشس، وغیرہ جیسے معین علاقوں کا خود مختاری رہنا ضروری ہے۔ علاقائی خود مختاری سے متعلق پہلی بات یہ ہے کہ اس کے تحت ایک مخصوص علاقے کی ایک مخصوص آبادی کو خود مختاری دی جاتی ہے۔ دوسرے یہ عوام کو مختلف قوموں میں تقسیم نہیں کرتی اور نہ قومی اختلافات کو مضبوط کرتی ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف اختلافات اور

تفریق کو مٹاتی ہے اور آبادی کو اس طرح متحد کرتی ہے کہ تقسیم کی ایک اور قسم کے لئے راستہ صاف ہو جاتا ہے اور وہ ہے طبقاتی تقسیم سب سے آخری فائدہ علاقائی خود مختاری میں یہ ہے کہ اس مخصوص علاقے کے لوگوں کو وہاں کی قدرتی دولت سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملتا ہے اور کسی مشترکہ مرکز کے فیصلوں کا بغیر انتظار کئے اس علاقے کی پیداواری قوتوں کو بھی بڑھانے کا موقع حاصل ہوتا ہے ۔

سوویت خودمختاری کی قسمیں اور خصوصیتیں

سوویت خودمختاری کوئی جامد اور ٹھہری ہوئی چیز نہیں ہے۔ جسے ایک ہی بار تمام آئندہ زمانے کے لئے مقرر کردیا گیا ہو۔ سوویت خودمختاری کی مختلف قسمیں اور مختلف درجے ہیں۔ مثلاً خودمختاری کی ایک قسم تو وہ ہے جس کے تحت کسی علاقے کو اپنے تنظیمی امور میں خودمختاری حاصل رہتی ہے۔ والگا کے جرمنوں، چوواش اور کیریلیوں کو اسی قسم کی خودمختاری حاصل ہے۔ اس سے وسیع خودمختاری باشکیریوں، والگا کے تاتاریوں اور کرغیزیوں کو حاصل ہے۔ اس میں بھی زیادہ سیاسی خودمختاری یوکرین اور ترکستان کو حاصل ہے۔ خودمختاری کی سب سے اعلیٰ قسم وہ ہے جو معاہدوں کے ذریعے

وجود میں آئی۔ آذربائیجان کو بھی خود مختاری حاصل ہے۔ سوویت خود مختاری کے اس لوچ اور تنوع کی وجہ سے ہی یہ ممکن ہوا ہے کہ ایسے سرحدی علاقوں کو وفاق میں شامل کر لیا گیا ہے۔ جن کے درمیان تہذیبی اور معاشی ترقی کے لحاظ سے بہت فرق پایا جاتا ہے۔ ہر علاقے کو اپنی حیثیت کے مطابق خود مختاری حاصل ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو روس کی خود مختار جمہوریتوں کو ایک ایسی بُری چیز سمجھتے ہیں جس کو عارضی طور پر ہمیں برداشت کرنا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس خود مختاری کو محدود کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ آگے چل کر اس کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ رویہ بالکل غلط اور یہ نظریہ بالکل جھوٹا ہے اور سوویت حکومت کی پالیسی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سوویت خود مختاری کوئی ہوائی چیز نہیں ہے اور نہ یہ محض الفاظ کا گورکھ دھندا ہے۔ سوویت خود مختاری ایک حقیقی شے ہے اور سرحدی علاقوں کو رُوس سے متحد کرنے کا سب سے ٹھوس اور سچّا طریقہ یوکرین، آذربائیجان، ترکستان، کرغیز جمہوریت باشکیر جمہوریّت، تاتار جمہوریّت اور دیگر سرحدی علاقے چونکہ اپنے اپنے عوام کی تہذیبی اور مادی خیر و فلاح اور ترقی کے لئے جد و جہد کر رہی ہیں اس لئے یہ بالکل ضروری ہے کہ ان کے اپنے اسکول ہوں، اپنی عدالتیں ہوں اور وہاں کے تنظیمی اور سرکاری اداروں کے لوگ خود انہیں لوگوں میں سے چُنے جائیں۔ جب تک یہ سب نہیں ہوتا۔ اس وقت تک

ان علاقوں میں سچے معنوں میں سوویت نظام قائم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کو مرکزی روس سے متحد کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر علاقے کے اپنے اسکول ہوں، اپنی عدالتیں ہوں اور اس کے امورِ حکومت اور امورِ انتظامیہ مقامی زبان میں چلائے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سوویت خود مختاری کو عمل میں لا رہے ہیں۔ سوویت خود مختاری اگر کوئی چیز ہے تو انہیں مختلف اور متعدد اداروں کا مجموعہ جو مختلف شکلوں میں ملبوس ہوتا ہے۔ مثلاً یوکرینی شکل، آزکستانی شکل یا کرغیزی شکل۔

ایسی حالت میں کوئی شخص کیونکر سنجیدگی کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ سوویت خود مختاری کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے اور اس کو رد کرنے کی کوشش کی جانی چاہیئے۔

دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ہو سکتی ہے۔ یا تو یوکرینی، آذربائیجانی، کرغیزی، ازبکی، باشکیری اور دیگر زبانیں واقعی اپنا وجود رکھتی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ ضروری ہے کہ ان علاقوں میں مقامی زبان کے اسکول، عدالتیں اور سرکاری ادارے وغیرہ قائم کئے جائیں اور ان کو ترقی دی جائے۔ ان اداروں میں مقامی زبان استعمال میں آئے اور ان کے کام کرنے والے خود انہیں لوگوں میں سے چُنے جائیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر یہ قطعی ضروری ہے کہ سوویت خود مختاری اپنی مجموعی حیثیت سے عمل میں لائی جائے اور اس پر کوئی پابندی

عائد نہ کی جائے۔

اور اگر ایسا نہیں ہے یعنی جن زبانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان کا کوئی وجود نہیں۔ اس لئے قومی علاقوں میں مادری زبان میں اسکولوں اور اداروں کا ہونا غیر ضروری ہے تو پھر سوویت خود مختاری ایک بیکار، فضول اور بے معنی شے ہے۔

ان دو کے علاوہ ہمارے سامنے کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے اور جو لوگ تیسرا راستہ تلاش کرتے ہیں۔ وہ یا تو موضوع کے متعلق کچھ نہیں جانتے یا افسوسناک حد تک سطحی ہیں۔

سوویت روس میں ایک ایسا تجربہ کیا جا رہا ہے جس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں۔ وہ تجربہ یہ ہے کہ وہاں کی بہت سی قومیں اور قبیلوں کو ایک واحد مزدور ریاست کے اندر امن و صلح کے ساتھ مل جل کر رہنے کی تنظیم کی جا رہی ہے۔ جس کی بنیاد اس بات پر قائم ہے۔ کہ اس وفاق میں تمام ریاستیں خود اپنی خواہش سے شامل ہوئی ہیں۔ اور ان کے درمیان باہمی اعتماد اور برادرانہ ہمدردی پائی جاتی ہے۔ یہ تجربہ پورے طور پر اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے۔ جبکہ قومی مسئلے کے متعلق ہماری عملی پالیسی سوویت خود مختاری کے اصولوں کے خلاف نہ ہو۔ وہی عملی پالیسی جس کا پہلے ہی اعلان کیا جا چکا ہے

سوویت خودمختاری کی شکلیں مختلف اور متعدد ہیں۔ کس علاقے کیلئے خودمختاری کی کون سی قسم موزوں ہو گی۔ اس کا انحصار اس مخصوص علاقے کے حالات پر ہے۔ کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان علاقوں میں ہم جو قدم اٹھائیں۔ وہ ایسا ہو۔ کہ اس سے وہاں کے عوام ایک بلندتر روحانی اور مادی تہذیب کی منزل پر آجائیں۔ اس پرولتاری تہذیب کی مختلف شکلیں ہر علاقے کے اپنے رسوم و رواج اور قومی خصوصیات کے مطابق ہوں گی ؛

منتشر اقلیتوں کے تحفظ کا سوال

وہ کونسی خاص بات ہے جو کسی ملک کے اندر بسنے والی اقلیت کو بغاوت پر ابھارتی اور اکساتی ہے؟

اقلیت اس لئے غیر مطمئن نہیں رہتی کہ ملک میں قومی اتحاد نہیں پایا جاتا۔ بلکہ وہ اس لئے غیر مطمئن رہتی ہے کہ اسے اپنی مادری زبان استعمال کرنے کا حق نہیں دیا جاتا۔ اگر اسے اپنی مادری زبان استعمال کرنے کا حق دے دیا جائے تو اس کی بے اطمینانی خود بخود دور ہو جائے گی۔ اقلیت کے غیر مطمئن رہنے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اس کے اپنے اسکول نہیں ہوتے۔ اگر اسے اپنے اسکول کھولنے کی اجازت دے دی جائے تو بے اطمینانی کے اسباب

ختم ہو جائیں۔ اقلیت اس لئے بھی غیر مطمئن رہتی ہے کہ اسے ضمیر کی آزادی اور نقل وحرکت کی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر اسے یہ تمام آزادیاں دے دی جائیں تو اُس کی بے اطمینانی ختم ہو جائے۔ بغرض قومی مسئلے کو حل کرنے کے لئے ان تمام چیزوں کا عطا کیا جانا ضروری ہے۔ جن سے مختلف اقوام میں قومی مساوات قائم ہوتی ہے۔ ملک میں ایسے سرکاری قانون کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو مکمل جمہوریت پر قائم ہو۔ جو تمام خاص خاص مراعات اور خاص خاص حقوق کو ختم کر دے اور اقلیتوں کے حقوق پر سے تمام پابندیاں ہٹا لے صرف انہیں کارروائیوں سے اقلیتوں کے حقوق کی کاغذی حفاظت نہیں بلکہ حقیقی حفاظت ہوتی ہے۔

مزدور طبقے کی واحد سیاسی جماعت

اگر مزدور مختلف قوموں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ تو اس کا بہت خراب نتیجہ نکلتا ہے۔ مزدوروں کی جمعیت منتشر ہو جاتی ہے اور مزدوروں کی انجمنیں قوموں میں تقسیم ہو جاتی ہیں اور علیحدہ علیحدہ قومی پالیسی کے مطابق چلنے لگتی ہیں۔ قوموں کے درمیان اختلافات بڑھ جاتے ہیں۔ قومی بنیادوں پر اور قومی اسباب کی بنا پر مزدوروں کی ہڑتالیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ اشتراکی تحریک میں انتشار پھیل جاتا ہے اور پستی آجاتی ہے۔ آسٹریا کی اشتراکی تحریک اور روس میں بنڈ (BUND) کی سیاسی سرگرمیوں کی مثالیں ثبوت کے لئے موجود ہیں۔ ان تمام باتوں کا

واحد علاج یہ ہے کہ بین الاقوامی پیمانے پر مزدوروں کی تنظیم کی جائے۔ تمام قوموں کے مزدوروں کو مختلف مقامات پر مختلف جماعتوں میں متحد کیا جائے اور پھر ان تمام جماعتوں کو ایک واحد سیاسی جماعت میں متحد اور منسلک کر دیا جائے۔ اس صورت میں ایک واحد جماعت کے ہوتے ہوئے بھی مختلف علاقوں کی خود مختاری ختم نہیں ہوتی۔ کاکیشس کا تجربہ اس قسم کی تنظیم کے مفید اور موزوں ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ کاکیشیا والوں نے اپنے علاقے کے آرمینی اور تاتار مزدوروں کے قومی اختلافات کو ختم کر دیا۔ اب باکو میں جہاں مختلف قومی جماعتوں کے لوگ رہتے ہیں۔ قومی تصادم کا امکان بالکل نہیں رہا۔ وہاں بسنے والی تمام قوموں کے مزدور ایک طاقتور تحریک کے دھاگے میں منسلک ہیں۔ اس کامیابی کا سہرا وہاں کی اشتراکی تحریک کے سر ہے جس کا کردار اور ڈھانچہ بین الاقوامیت کے اصول پر قائم کیا گیا ہے۔

مزدوروں کی جماعتوں کا تنظیمی ڈھانچہ ایک بہت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا اثر مزدوروں پر نہ صرف عملی دنیا میں پڑتا ہے۔ بلکہ مزدوروں کی پوری ذہنی زندگی بھی اس سے متاثر ہوتی ہے۔ مزدور کی زندگی اور اس کی تنظیمی جماعت کی زندگی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ مزدور اپنی تنظیمی جماعت کی زندگی گزارتا ہے۔ یہ تنظیم اس کی دماغی

ترقی کو ابھارتی ہے اور اس کی تعلیم و تربیت کرتی ہے۔ مزدور اپنی تنظیم میں شامل ہو کر اس کے ذریعے دوسری قوموں کے مزدور ساتھیوں سے مل جل کر کام کرنے کے بعد اور مشترکہ جماعت کی رہنمائی میں اور مشترکہ جدوجہد میں حصہ لے کر یہ بات اچھی طرح سمجھ لیتا ہے کہ تمام مزدور ایک ہی طبقے کے افراد ہیں اور یہ طبقہ ایک خاندان کی حیثیت رکھتا ہے۔ مزدوروں کی بھاری اکثریت کے دل و دماغ پر اس چیز کا ایک زبردست تعلیمی اثر پڑتا ہے۔

بین الاقوامی طرز کی مزدور تنظیم مختلف قوموں کے افراد کے درمیان برادرانہ جذبات و خیالات پیدا کرنے کے لئے درس گاہ کا کام دیتی ہے اور بین الاقوامیت کے ہاتھوں میں ایک زبردست آلۂ تحریک ثابت ہوتی ہے۔ برخلاف اسکے جو مزدور جماعتیں علیٰحدہ علیٰحدہ قومی بنیادوں پر قائم ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ یہ بات کبھی نہیں ہوتی۔ مزدور علیٰحدہ علیٰحدہ قومی جماعتوں میں بٹ جانے کے بعد اپنا اتحاد کھو بیٹھتے ہیں اور ان کے درمیان آپس ہی میں ایک دوسرے کے خلاف دیواریں حائل ہو جاتی ہیں۔ علیٰحدہ علیٰحدہ قومی مزدور جماعتوں میں مزدوروں سے متعلق مشترک باتوں پر زور نہیں دیا جاتا۔ بلکہ ان باتوں پر زور دیا جانے لگتا ہے جو مزدوروں کو ایک دوسرے سے علیٰحدہ کرتی ہیں۔ اس قسم کی جماعت بندیوں میں مزدور اوّلین اہمیت کے اعتبار سے اپنی قوم کا ایک فرد ہوتا ہے۔ یعنی وہ سب سے پہلے یہودی ہوتا ہے

یا پولی، یا جرمن، یا فرانسیسی اور بعد میں مزدور۔ چنانچہ مزدور تنظیم کے سلسلے میں قومی وفاق بندی کے اصول کی پابندی مزدوروں کے اندر قومی علیحدگی کی اسپرٹ پیدا کرتا ہے۔ مزدوروں کے بین الاقوامی اتحاد اور استحکام سے ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت اور تشدد کے مسئلے کو حل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

اشتراکی اور قومی تحریک

ہم سوویت نظام کے اندر ایک مزدور تہذیب کی تعمیر کر رہے ہیں۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس مزدور تہذیب کی سرشت اور ماہیت تو اشتراکی ہے۔ لیکن اس کی شکلیں مختلف اور اس کا طریقۂ اظہار بھی مختلف قوموں میں مختلف ہے۔ یہ اختلاف قوموں کے نجی حالات اور ان کی قومی خصوصیات کے متوازی رہا ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد زبان، رسوم و رواج وغیرہ وغیرہ کے فرق پر قائم ہے۔ ہم جس تہذیب کی تعمیر کر رہے ہیں۔ اس کی اندرونی خصوصیت تو پرولیتاری

یعنی مزدورانہ ہے۔ لیکن اس کی شکلیں قومی ہیں۔ یہ ہے وُہ عالم گیر انسانی تہذیب جس کی طرف اشتراکیت قدم بڑھا رہی ہے۔ پرولیتاری تہذیب قومی تہذیب کو ختم نہیں کرتی۔ بلکہ اسے ایک خاص قسم کی سرشت اور ایک خاص قسم کی ماہیت عطا کرتی ہے۔ اسی طرح قومی تحریک پرولتاری تہذیب کو ختم نہیں کرتی۔ بلکہ اسے ایک خاص شکل عطا کرتی ہے۔ جب تک سرمایہ دار طبقے کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار کی باگ ڈور رہی اور مختلف قوموں کا اجتماع سرمایہ دارانہ نظام کے تحت رہا۔ اس وقت تک قومی تہذیب کا مطالبہ سرمایہ دار طبقے کا مطالبہ رہا۔ لیکن جب مزدور طبقہ برسرِ اقتدار ہوا۔ اور سوویت حکومت کی رہنمائی میں قوموں کے اتحاد اور استحکام کا کام شروع ہوا۔ تو قومی تہذیب کا مطالبہ مزدور طبقے کا مطالبہ ہو گیا۔ "کاٹسکی" اور اس کے حامی کہتے ہیں کہ اشتراکیت کے عہد میں ایک واحد عالمگیر زبان قائم ہونی چاہئے اور تمام دیگر زبانوں کا ختم ہو جانا ضروری ہے۔ میں (یعنی اسٹالین) ایک واحد عالمگیر زبان کے نظریئے کا قائل نہیں ہوں۔ میرا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ ابھی تک تو صورت یہ رہی ہے کہ اشتراکی انقلاب نے زبان کی تعداد گھٹانے کی بجائے اور بڑھا دی ہے

اشتراکی انقلاب انسانیت کی عمیق ترین گہرائیوں میں ہل چل اور اضطراب پیدا کر دیتا ہے اور اس ہل چل میں اور اضطراب کو سیاست کے میدانِ کارزار میں گھسیٹ کر بہت سی ایسی قوموں کو نئی زندگی کی حرارت سے روشناس کرا دیتا ہے۔ جو انقلاب سے پہلے تک گمنامی میں پڑی ہوتی ہیں۔ زار کے زمانے کے روس میں کم سے کم پچاس قومیں اور نسلی جماعتیں آباد تھیں۔ اکتوبر کے انقلاب نے پرانی زنجیروں کو توڑ کر اور بہت سی بھولی ہوئی قوموں اور انسانی جماعتوں کو منظرِ عام پر لا کر ان کے اندر ایک نئی زندگی پیدا کر دی اور ان میں ترقی کی ایک نئی روح پھونک دی۔ آج کل ہندوستان کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہ ایک واحد کل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں کوئی انقلابی لہر پھیلی تو بہت سی ایسی قومیں اپنی اپنی زبان اور اپنی اپنی تہذیب کو لے کر منظرِ عام پر ابھر آئینگی جو اب تک گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں۔ اگر پرولتاری تہذیب کی تعمیر میں مختلف قوموں کے حصّہ لینے کا سوال پیدا ہوگا تو مختلف قومیں اپنے اپنے رسوم و رواج اور زبان کے مطابق ہی ایک دوسرے سے اشتراکِ عمل کر سکتی ہیں اور پرولتاری کی تعمیر میں ہاتھ بٹا سکتی ہیں۔

بریئت[1] کے کامریڈ ایک عالمگیر پرولتاری تہذیب کی تشکیل اور تعمیر کے دوران میں قوموں کے ایک دوسرے میں مدغم ہو جانے کا سوال اٹھاتے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ کچھ قومیں ایک دوسرے میں ضم ہو سکتی ہیں اور یقیناً ہو جائیں گی۔ ایسا اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ لیکن اگر قومیں آپس میں مدغم ہو جائیں گی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ متعدد طاقتور قوموں کی انفرادی ترقی اور ان کا انفرادی استحکام رُک جائے گا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ قوموں کے ایک دوسرے میں ضم ہونے سے پہلے ضروری ہے کہ قوموں کی انفرادی ترقی عمل میں آئے۔ قوموں کا ایک دوسرے میں مدغم ہو جانے کا عمل علیحدہ علیحدہ قوموں کی ترقی کے پورے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے عالمگیر پرولتاری تہذیب قومی تہذیب کے امکان کو ختم نہیں کرتی۔ بلکہ اس کو ضروری قرار دیتی ہے اور اس کی نشوونما کرتی ہے۔ بالکل اسی طرح قومی تہذیب عالمگیر پرولتاری تہذیب کو منسوخ نہیں کرتی۔ بلکہ اسکی اعانت کرتی ہے اور اُس کو پہلے سے زیادہ بھرپور اور مکمل بناتی ہے۔

[1] روس کی ایک قوم کا نام

لینن اور قومی تہذیب

لینن نے کبھی یہ نہیں کہا کہ عالمگیر پیمانے پر اشتراکیت کی فتح سے پہلے کسی واحد ریاست کے حدود میں تمام قومی فرق مٹ جائیں گے اور قومی زبانیں ایک مشترکہ زبان میں مدغم ہو جائیں گی۔ لینن نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ اس کے بالکل برخلاف ہے۔ اس نے کہا ہے کہ عالم گیر پیمانے پر مزدوروں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد بھی قوموں اور ملکوں کے قومی اور سیاسی فرق بہت زمانے تک موجود رہیں گے۔

لینن نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم و تشدد کے ختم ہو جانے اور تمام قوموں کے مفاد کے ایک ہو جانے کا یہ مطلب ہے

کہ قوموں کا باہمی فرق مٹ جائے گا۔ ہم نے سوویت نظام میں ایک قوم پر دوسری قوم کے ظلم و ستم کو ختم کر دیا ہے۔ بعض قوموں کو دوسری قوموں کے مقابلے میں جو مراعات حاصل تھیں۔ ان کو بھی ہم نے مٹا ڈالا ہے اور قومی مساوات قائم کی ہے۔ ریاستوں کے درمیان پرانے مفہوم میں جو سرحدیں اور دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ ان کو بھی ہم نے توڑ ڈالا ہے۔ یعنی اب سوویت قوموں کے درمیان محصولات اور کروڑگیری کی دیواریں حائل نہیں رہیں۔ سرحدوں پر اب قومی اڈے نہیں رہے۔ ہم نے تمام سوویت قوموں کے معاشی اور سیاسی مفاد میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے قومی فرق کو بھی مٹا دیا۔ ہم نے قومی زبان، قومی تہذیب اور قومی رسوم و رواج کو برقرار رکھا چنانچہ تاریخ کے اس دور میں قومی جمہوریتوں اور علاقہ بندیوں کو مٹا دینے کا مطالبہ ایک رجعتی مطالبہ ہے اور مزدور حکومت کے اصولوں اور مفاد کے خلاف۔ اس وقت قومی جمہوریتوں اور علاقوں کو ختم کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ سوویت نظام کے اندر بسنے والی قوموں کے عوام کو خود اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع سے محروم کر دیا جائے اور انہیں اپنے اسکول، اپنی عدالتیں اور اپنے سرکاری انتظام قائم کرنے سے روکا جائے۔ ان کے پبلک اور سرکاری اداروں اور انجمنوں میں مقامی زبان

استعمال کرنے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔ ان کو اشتراکی تعمیر میں حصّہ لینے سے محروم کیا جائے۔ جو لوگ قومی جمہوریتوں اور علاقوں کو ختم کر دینے کے قائل ہیں۔ وہ جھوٹی اور نقلی قسم کی بین الاقوامیت کی تلاش میں رجعت پرست روسی قوم پرستوں کے پنجے میں پھنس گئے ہیں۔ یہ حضرات "مزدور حکومت میں تہذیبی انقلاب" کا نعرہ بھول گئے ہیں۔ جس کا مساوی طور پر سوویت نظام میں بسنے والی تمام قوموں پر اطلاق ہوتا ہے یعنی رُوسی اور غیر رُوسی دونوں قوموں پر۔

لینن نے یہ کبھی نہیں کہا کہ قومی تہذیب کو ترقی دینا مزدور حکومت کے تحت رجعت پرستی کے مترادف ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف لینن نے ہمیشہ اس بات کی حمایت کی ہے کہ سوویت نظام کے اندر بسنے والی قوموں کو اپنی اپنی قومی تہذیب کو ترقی دینے کے کام میں مدد دی جائے۔ لینن ہی کی رہنمائی میں دسویں پارٹی کانگریس نے قومی مسئلے پر ایک تجویز پاس کی جس میں صاف صاف طور پر مندرجہ ذیل باتیں درج ہیں:۔

"پارٹی کے سامنے یہ اہم کام ہے کہ غیر روسی قوموں کے محنت کش عوام کی مدد کی جائے۔ تاکہ وہ مرکزی روس کی ترقی کی سطح پر آجائیں۔ مندرجہ ذیل باتوں میں ان کی مدد کی جائے۔

(۱) ہر قوم کے محنت کش عوام خود اپنا سوویت ریاستی نظام قائم

کریں اور اس کو ترقی دیں اور مستحکم بنانے کی کوشش کریں۔ یہ سوویت ریاستیں ایسی شکل اختیار کریں جو ہر قوم کے سماجی حالات کے مطابق ہو (۲) ہر قوم خود اپنی عدالتیں سرکاری ادارے اپنے معاشی محکمے اور انجمنیں قائم کرے۔ ان تمام اداروں میں مقامی زبان استعمال میں لائی جائے اور تمام عہدوں پر مقامی لوگ بھرتی کیے جائیں اس لئے کہ وہ مقامی آبادی کی نفسیات اور رسوم و رواج سے واقف ہوں گے (۳) ہر قوم کا اپنا پریس ہو۔ اپنے اسکول، اپنے تھیٹر اور اپنے کلب اور اپنے تہذیبی اور تعلیمی ادارے ہوں اور یہ سب کے سب مادری زبان میں ہوں۔ (۴) نصابوں اور اسکولوں کا ایک وسیع اور جامع سسٹم بنایا جائے جس کا مقصد عام تعلیم دینا ہو اور پیشہ وارانہ اور فنی تربیت کا انتظام کرنا ہو۔ یہاں بھی مقامی زبان ہی استعمال میں لائی جائے۔"

اوپر کی تجویز سے یہ صاف ظاہر ہو گیا ہو گا کہ لینن مزدور حکومت کے تحت مختلف قومی تہذیبوں کو ترقی دینے کا پورا پورا حامی تھا۔ ممکن ہے یہ بات تعجب انگیز معلوم ہو کہ ہم ایک طرف تو اس بات کے قائل اور حامی ہیں کہ آگے چل کر شکل اور ماہیت کے اعتبار سے تمام قومی تہذیبیں

ایک مشترکہ تہذیب میں مدغم ہو جائیں گی اور اس مشترکہ تہذیب کی ایک واحد مشترکہ زبان ہو گی۔ لیکن دوسری طرف ہم موجودہ زمانے میں یعنی پرولیتاری آمریت کے عرصے میں مختلف قومی تہذیبوں کے الگ الگ نشو و نما پانے کی حمایت کر رہے ہیں۔ بظاہر ان دو باتوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن در اصل ایسا ہر گز نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام قومی تہذیبوں کو ترقی کرنے، پھیلنے اور اپنی تمام پوشیدہ خوبیوں کو ظاہر کرنے کا موقع دیا جائے۔ تاکہ وہ حالات پیدا ہو سکیں۔ جن کے تحت تمام قومی تہذیبیں مل کر ایک ہی مشترکہ تہذیب کی شکل اختیار کر لیں جس کی ایک ہی مشترکہ زبان ہو۔ پہلے تو یہ ہو گا کہ ہر ملک میں مزدور راج کے زیر سایہ قومی تہذیبوں کی الگ الگ نشو و نما ہو گی۔ اس طرح کہ ان کی شکل تو قومی ہو گی۔ لیکن ماہیت اشتراکی ہو گی۔ اس کا مقصد یہ ہو گا کہ تمام تہذیبیں ایک واحد مشترکہ اشتراکی تہذیب میں مدغم ہو جائیں گی۔ اس مشترکہ تہذیب کی شکل اور ماہیت دونوں اشتراکی ہونگی اس تہذیب کی اپنی ایک مشترکہ زبان ہو گی۔ یہ اس وقت ہو گا۔ جب ساری دنیا میں مزدور طبقے کی فتح ہو گی اور اشتراکیت آئے دن کی چیز ہو جائیگی۔

ممکن ہے لوگ یہ کہیں کہ اس تصور میں تضاد کا پہلو پایا جاتا ہے ہم ان سے یہ کہیں گے کہ ریاست کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ہم نے جو رویہ اختیار کیا ہے۔ اس میں بھی تضاد کا پہلو موجود ہے۔ ہم ایک طرف

اس بات کے حامی ہیں کہ ریاست آہستہ آہستہ معدوم ہو جائے۔ لیکن ہم اس کے ساتھ ساتھ مزدوروں کی ریاست اور حکومت کو مضبوط اور طاقتور بنانے کے بھی حق میں ہیں۔ مزدوروں کی یہ حکومت تاریخ انسانی کی سب سے طاقتور حکومت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ریاست کے وجود کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کے لئے ضرورت ہے کہ مزدور ریاست کے اقتدار کو اعلیٰ ترین معیار پر لے جایا جائے۔ کیا اس میں تضاد کا پہلو موجود نہیں ہے ہاں تضاد ضرور موجود ہے۔ لیکن یہ تضاد ایک زندہ و پائندہ شے ہے۔ اور مارکسی جدلیات کا مکمل عکس۔ اسی سے ریاست کا وجود ختم ہو سکتا ہے۔

محمد عبدالجبار عباسی خوشنویس لاہور

ترقی پسند فنکاروں کی تخلیقات کا ترجمان

سویرا

- عوامی مسائل پر عوامی فنکاروں کا تبصرہ ھے۔
- ان مستند ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی نگارشات پیش کرتا ھے جو ایشیائی زندگی کی نشاۃ الثانیہ پر اٹوٹ اعتماد رکھتے ھیں۔
- ادب کے اس بلند نصب العین کا عکاس ھے جو جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل کی تفریق سے بالا ھے۔
- ماضی، حال اور مستقبل میں ایک ادبی تسلسل قائم کرتا ھے۔
- حسن طباعت اور ادبی اجتہاد پر حرف آخر کی حیثیت رکھتا ھے۔

ھر **سویرا** ایک نئے **سویرا** کا پیامی ھوگا

اس کا ھر نمبر ایک ایسی امٹ مستقل اور لافانی کتاب ھوگی

جو نہ صرف آپ کے لئے

بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی نشان راہ ہ

فی کاپی دو روپے - سالانہ دس روپے

★

نیا ادارہ ● لاھور